حدود آرڈیننس

اور

تحفظ نسواں بل

ابو عمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

جملہ حقوق محفوظ!

کتاب	’حدود آرڈیننس‘ اور ’تحفظ نسواں بل‘
ناشر:	الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
	فون: 055-4271741 / 4000394
	aknasir2003@yahoo.com
تقسیم کنندہ:	دارالکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
	فون: 042-7235094
اشاعت اول:	فروری ۲۰۰۷
قیمت:	120 روپے

فہرست

o پیش لفظ ۵

☆ ’حدود آرڈیننس‘ اور ’تحفظ نسواں بل‘: پس منظر اور پیش منظر

o حدود آرڈیننس میں ترامیم کا پس منظر ۱۱

☆ حدود آرڈیننس کی مخالفت: فکری ونظریاتی کشمکش کا جائزہ

o حدود آرڈیننس اور سیکولر طبقہ ۳۱

o حدود آرڈی ننس: مخالفت کیوں؟ ۳۷

o محترم جاوید غامدی اور ڈاکٹر طفیل ہاشمی کی توضیحات ۴۳

o حدود آرڈی ننس اور الطاف حسین کا بیان ۴۷

☆ حدود قوانین کی تعبیر وتشریح اور اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار

o اسلامی حدود اور بین الاقوامی قوانین ۵۵

o اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ پر چند گزارشات ۶۱

o تحفظ حقوق نسواں بل اور اسلامی نظریاتی کونسل ۶۷

☆ حدود قوانین اور ہمارا قانونی وعدالتی نظام

o تحفظ حقوق نسواں بل: سسٹم کو درست کیا جائے ۷۵

o حدود آرڈی ننس: تاثرات وخیالات ۸۳

☆ تحفظ نسواں بل کے بارے میں علما اور دینی حلقوں کا موقف

- تحفظ نسواں بل سے متعلق علما کمیٹی کی سفارشات ۹۷
- خصوصی علما کمیٹی نظریہ کونسل کی متبادل نہیں ۱۰۳
- تحفظ نسواں بل کے بارے میں خصوصی علما کمیٹی کا موقف ۱۱۱
- وقت کی آواز ۱۲۱
- مجلس تحفظ حدود اللہ کا قیام اور متحدہ مجلس عمل کی ریلی ۱۲۷
- مجلس تحفظ حدود اللہ کا کنونشن ۱۳۵
- خواتین کے حقوق اور دینی طبقے کی ذمہ داریاں ۱۳۹

☆ ضمیمہ

- تحفظ نسواں بل کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علما کی طرف سے چودھری شجاعت حسین کو پیش کی جانے والی تحریر ۱۴۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمده تبارك وتعالى ونصلى ونسلم على رسوله الكريم وعلى آله واصحابه واتباعه اجمعين۔

قیام پاکستان کے بعد جب اسلام کے نام پر بننے والی اس ریاست کو دستوری طور پر قرارداد مقاصد کے ذریعے سے ایک نظریاتی اسلامی مملکت قرار دے دیا گیا تو اس کا ناگزیر تقاضا تھا کہ ملک کے عدالتی، انتظامی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچوں کا ازسرنو جائزہ لے کر ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل اور نشوونما کے لیے سماجی محنت کے ساتھ ساتھ ضروری قانون سازی بھی کی جاتی۔ اسی بنیاد پر ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلام کو ملک کا ریاستی دین قرار دیا گیا اور قرآن وسنت کے منافی قانون سازی کی دستوری ممانعت کے ساتھ ساتھ ملک کے مروجہ قانونی نظام پر نظر ثانی اور تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت دی گئی، لیکن دوسری طرف قیام پاکستان کے بعد سے بلکہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے بعد بھی اس سلسلے میں ملک کے مقتدر حلقوں (Establishment) کا رویہ ہمیشہ غیر سنجیدہ رہا۔ دینی حلقوں کے مطالبات پر عوامی دباؤ کے تحت اگر کسی معاملے میں کوئی پیش رفت ناگزیر ہوئی تو دفع الوقتی کے طور پر مجبوری کے درجے میں قدم اٹھالیا گیا، لیکن نفاذ اسلام اور مروجہ قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل ہمارے ہاں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے ارباب اختیار کے اپنے ایجنڈے اور ترجیحات میں

کبھی شامل نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقصد کے لیے اب تک جو قانون سازی کسی نہ کسی درجے میں ہوگئی ہے، وہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کی طرح ہمارے ملک کی داخلی اسٹیبلشمنٹ کے حلق سے بھی نیچے نہیں اتر رہی اور اس میں کسی مزید پیش رفت کے بجائے سرے سے اس سے جان چھڑانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کا موقف اور طرز عمل تو سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام کے نام پر کسی آزاد ریاست کا وجود ہی اس کے طے کردہ عالمی نظام اور انسانی حقوق کے مغربی فکر وفلسفہ کے منافی ہے اور آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر مغرب کی زیر قیادت ورلڈ اسٹیبلشمنٹ نے گلوبل تہذیب وثقافت اور فلسفہ ونظام کا جو ڈھانچہ دنیا پر میڈیا، دولت اور طاقت کے زور سے بہر حال مسلط کر دینے کا جو تہیہ کر رکھا ہے، اسلام بطور نظام وقانون اس کے کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھتا، بلکہ اس کی راہ میں ایک مضبوط رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن ہماری لوکل اسٹیبلشمنٹ اس حوالے سے دو رخی اور منافقت کا شکار ہے۔ وہ ایک طرف اس بات کا حوصلہ نہیں رکھتی کہ پاکستان کے اسلامی نظریاتی تشخص سے انکار کر سکے اور اسلام کے سیاسی، عدالتی، معاشی اور معاشرتی کردار کی نفی کر سکے کہ وہ اس حوصلے اور اخلاقی جرات سے محروم ہے، لیکن دوسری طرف اس سلسلے میں اس کی تمام تر ہمدردی، وفاداری اور کمٹمنٹ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ہے اور وہ اسے عملی طور پر بروے کار لانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ مقتدر حلقوں کی اسی دورخی اور تضاد نے ملک کو مسلسل قانونی بحران سے دوچار کر رکھا ہے اور ہمارا قانونی نظام تضادات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔

ہمارے حکمرانوں نے اپنی اس منافقت پر پردہ ڈالنے کے لیے دو باتوں کا بطور خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ ایک یہ کہ وہ جو کام بھی کرتے ہیں، خواہ وہ قرآن وسنت کی صریح نصوص کے صراحتاً منافی ہو، اسے قرآن وسنت کے نام سے ہی پیش کیا جاتا ہے اور سرکاری ذرائع ابلاغ اور حلقے اس امر کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ جو کچھ کیا گیا ہے، وہ قرآن وسنت کی منشا تھی اور ایسا کر کے قرآن وسنت ہی کے تقاضوں کو بروے کار لایا گیا ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی مثال سامنے رکھ لیجیے۔ ابھی حال میں پارلیمنٹ سے منظور ہونے والے تحفظ حقوق نسواں ایکٹ میں

دیگر بہت سی دفعات کے ساتھ ساتھ قذف کی سزا کے سلسلے میں بھی قرآن کریم کی مقرر کردہ سزا ۸۰ کوڑوں کو پانچ سال قید کی سزا میں بدل دیا گیا ہے، لیکن وزیر اعظم اور سرکاری مسلم لیگ کے سربراہ سمیت تمام مقتدر شخصیات پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کیے جا رہی ہیں کہ ایسا کر کے ہم نے قرآن پاک پر ہی عمل کیا ہے۔

اس کے ساتھ دوسرا اہتمام اس امر کا کیا گیا ہے کہ قرآن وسنت کے احکام کے بارے میں میڈیا اور لابنگ کے ذرائع کو مسلسل استعمال کر کے شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں اور اسلام پر مغرب کے اعتراضات کو اپنی زبان میں بار بار دہرا کر لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی احکام کے بارے میں تردد، تذبذب اور شک وشبہ کی فضا قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت ہمارے ان دانش وروں کی ہے جو قرآن وسنت کی خدمت اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کے عزم کے ساتھ مختلف فکری حلقے قائم کیے ہوئے ہیں، لیکن ان کی فکری اور عملی کاوشوں کے نتائج اسلامی تعلیمات کے ساتھ مغربی فکر وفلسفہ کی کشمکش کے تناظر میں اسلامی احکام کے بارے میں شکوک وشبہات میں اضافہ کا ذریعہ بن رہے ہیں اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نئی نسل کو علما کے دائرۂ اثر سے نکال کر اور اسے دین کی تعبیر وتشریح کے روایتی ڈھانچے سے بغاوت کا درس دے کر اسلام کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں۔

جہاں تک جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے، آج کے عالمی عرف وحالات کا ادراک حاصل کرنے اور اجتہاد کے مسلمہ اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے اسلامی احکام وقوانین اور جدید تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا تعلق ہے، ہمیں اس کی ضرورت سے انکار نہیں ہے بلکہ ہم خود اس کے داعی ہیں اور اس کا احساس بیدار کرنے کے لیے حتی الوسع کوشش بھی کر رہے ہیں، لیکن مغرب کے فکر وفلسفہ کی بالادستی اور اس کی ثقافت واقدار کے غلبہ کو ذہنی طور پر قبول کرتے ہوئے اسلامی احکام وقوانین کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کا دائرہ اس سے قطعی طور پر مختلف ہے، مگر ہمارے بعض دانش وروں نے شعوری یا لاشعوری طور پر ان دونوں دائروں کو اس قدر گڈ مڈ کر دیا ہے کہ شرعی اجتہاد کے ضروری تقاضوں اور مغرب کے فکری وثقافتی مطالبات میں کوئی حد فاصل

قائم کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

حدود آرڈیننس میں ترامیم اور تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے حوالے سے ہم نے مختلف اخبارات وجرائد میں شائع ہونے والے اپنے مضامین میں ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے اسلام کے خلاف ایجنڈے، لوکل اسٹیبلشمنٹ کے تضاد اور دورخی، اور بعض دانش وروں کے پیدا کردہ اسی کنفیوژن کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جسے ہمارے بہت سے احباب نے پسند کیا ہے اور انھیں کتابی صورت میں یکجا شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان دوستوں کی خواہش پر یہ مضامین کتابی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

یہ مضامین چونکہ مختلف مواقع پر ایک ہی عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں، اس لیے ان میں بعض جگہ تکرار بھی پایا جائے گا، لیکن ایسی صورت میں اس قسم کا تکرار ایک حد تک ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین اسے زیادہ محسوس نہیں کریں گے اور اس حقیر سی کاوش کو قبول کرتے ہوئے ہمیں اپنی مخلصانہ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں گے۔

ابو عمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

۹ر فروری ۲۰۰۷

'حدود آرڈیننس' اور 'تحفظ نسواں بل'

پس منظر اور پیش منظر

’حدود آرڈیننس‘ میں ترامیم کا پس منظر

[۶ ردسمبر ۲۰۰۶ء کو بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے عمر بن الخطابؓ ہال میں جمعیۃ طلباے اسلام کے زیر اہتمام ایک نشست میں حدود آرڈیننس اور تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں خطاب]

سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حدود کیا ہیں؟ ان کے لیے آرڈی ننس کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ آرڈیننس کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے ؟ اہم اعتراضات کیا ہیں ؟ تحفظ حقوق نسواں بل کے ذریعے سے اس میں کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں؟ اس حوالہ سے موجودہ قانونی صورت حال کیا ہے؟ اس سلسلہ میں دینی حلقوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟

’حدود‘ کا لفظ قرآن کریم نے مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے لیکن شریعت اور فقہ اسلامی میں یہ لفظ اصطلاح کے طور پر ان سزاؤں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے جو چند جرائم میں قرآن وسنت کی طرف سے متعین طور پر طے کر دی گئی ہیں۔ معاشرتی جرائم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور انہیں سینکڑوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ تعزیرات پاکستان کی دفعات پانچ سو سے متجاوز ہیں مگر ان سینکڑوں جرائم میں سے قرآن وسنت نے صرف چند کی سزا خود متعین کی ہے۔ باقی تمام جرائم کی سزاؤں کا تعین ایک اسلامی حکومت یا مسلم حکومت یا ان کے مجاز اداروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق ان جرائم کی سزاؤں کی مقدار اور نوعیت خود طے کر لیں، البتہ چند جرائم مثلاً زنا، چوری، قذف، ڈکیتی، شراب نوشی، اور ارتداد وغیرہ کی سزائیں قرآن وسنت میں متعین کر دی گئی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، زنا کی سزا ایک صورت میں سنگسار کرنا اور دوسری صورت میں

سو کوڑے مارنا ہے، قذف یعنی کسی پاک دامن عورت پر بدکاری کی تہمت لگانے کی سزا اس کا ثبوت پیش نہ کر سکنے کی صورت میں ۸۰ کوڑے لگانا ہے، ڈکیتی کی سزا ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قتل کرنا یا سولی پر لٹکانا یا جلاوطن کر دینا ہے اور شراب نوشی کی سزا ۸۰ کوڑے لگانا ہے۔ ان سزاؤں کے حوالہ سے دو باتیں اصولی طور پر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

ایک کہ یہ بطور آپشن نہیں ہیں بلکہ بطور آرڈر کے ہیں، یعنی ان کو اختیار کرنے اور نافذ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہمیں اس امر کا اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم چاہیں تو انہیں اختیار کر لیں اور ہمارا موڈ نہ ہو تو انہیں نظر انداز کر دیں۔ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ جس طرح قرآن وسنت میں نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کے فرائض کا حکم دیا گیا ہے، اسی انداز میں اور انہی صیغوں کے ساتھ قصاص اور حدود کے قوانین کے نفاذ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھ لیں کہ قرآن کریم میں جس مقام پر روزہ کی فرضیت بیان کی گئی ہے کہ ’’اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں‘‘، اس کے ساتھ ہی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ’’اے ایمان والو! تم پر قصاص کا قانون فرض کیا گیا ہے۔‘‘ اسی طرح جیسے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا حکم امر کے صیغے کے ساتھ دیا گیا ہے، وہی امر کا صیغہ رجم اور کوڑے مارنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے، اس لیے ان احکام میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نماز فرض ہے تو قصاص کے قانون کا نفاذ بھی فرض ہے، اور اگر زکوٰۃ فرض ہے تو زانی کو کوڑے مارنا بھی فرض ہے، اور اسی حوالہ سے میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن وسنت میں ان احکام وقوانین کا ذکر بطور آپشن کے نہیں بلکہ بطور آرڈر کے کیا گیا ہے اور ہم قرآن وسنت پر ایمان رکھتے ہوئے جس طرح نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے فرائض کے پابند ہیں، اسی طرح حدود وقصاص کے ان قوانین کو نافذ کرنے کے بھی پابند ہیں۔

دوسری بات جو اس سلسلہ میں بطور اصول سامنے رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ ہم ان سزاؤں میں اپنی طرف سے ردوبدل کے مجاز نہیں ہیں۔ مثلاً ہم یہ نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم نے قذف کی سزا ۸۰ کوڑے بیان کی ہے تو ہم اس کی نوعیت یا مقدار بدل دیں کہ کوڑوں کی بجائے قید کی سزا مقرر کر لیں یا ۸۰ کوڑوں کی بجائے اس سے کم یا زیادہ مقدار طے کر لیں۔ ہم ان سزاؤں کے نفاذ کے بھی

پابند ہیں اور ان کی نوعیت اور مقدار کو برقرار رکھنے کے بھی پابند ہیں۔ ان دونوں معاملات میں قیامت تک کسی کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا اور کوئی بھی شخص، طبقہ یا ادارہ ایسا کرتا ہے تو وہ حدود اللہ سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے جسے قرآن کریم نے ظلم اور نافرمانی سے تعبیر کیا ہے۔

حدود شرعیہ کے اس مختصر تعارف کے بعد یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں اگر اسلام کا نظام نافذ ہوگا تو ظاہر بات ہے کہ ان حدود کا نفاذ بھی ضروری قرار پائے گا۔ یہ بات درست ہے کہ صرف ان حدود کا نام اسلام نہیں ہے اور اسلام کا نفاذ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حدود اسلام کا ایک اہم شعبہ ہیں اور انہیں نظر انداز کر کے کسی ملک میں نفاذ اسلام کی منزل حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے دینی حلقوں کا مسلسل یہ مطالبہ چلا آرہا تھا کہ قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح جرم وسزا کے شعبہ میں اسلامی احکام وقوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ پاکستان کا قیام اسلامی نظریہ حیات کی عملداری اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عمل میں آیا تھا اور قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم سمیت تحریک پاکستان کے تمام ذمہ دار راہ نماؤں نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں قرآن وسنت کی عملداری ہوگی اور اسے ایک آئیڈیل اسلامی ریاست بنایا جائے گا، لیکن قیام پاکستان کے بعد مسلسل مطالبات اور تحریکات کے باوجود ایسا نہ ہوسکا حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کی زبردست عوامی تحریک نظام مصطفیٰ کے بعد جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے اس عوامی مطالبہ پر حدود آرڈیننس سمیت متعدد دیگر اسلامی قوانین کے نفاذ کی طرف پیش رفت کی۔ یہاں میں ایک مغالطہ کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عام طور پر بڑے بھولپن کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ حدود آرڈیننس یا اس نوعیت کے بعض دیگر شرعی قوانین ایک فوجی آمر کے نافذ کردہ قوانین ہیں اور یہ ڈکٹیٹر کے قوانین ہیں جنہیں ختم ہوجانا چاہیے۔ اگر اس دلیل پر بات کی جائے تو تحفظ حقوق نسواں بل بھی ایک فوجی آمر کا نافذ کردہ قانون ہے، اس کے باقی رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حدود آرڈیننس بلاشبہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے نافذ کیے تھے، لیکن ان کے پیچھے ۷۷ء کی عظیم الشان عوامی تحریک تھی جس میں پورا ملک اسلامی نظام کے

نفاذ کا مطالبہ لے کر سڑکوں پر آ گیا تھا، ہزاروں افراد جیلوں میں گئے تھے اور سینکڑوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ پھر یہ حدود آرڈیننس جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے اپنے ذہن کے اختراع نہیں تھے۔ اس کے لیے اس وقت کی اسلامی نظریاتی کونسل نے مہینوں کام کیا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ جیسے اکابر اہل علم سے استفادہ کیا گیا تھا۔ دوسرے مسلم ممالک کے علما سے بھی رابطے کیے گئے تھے حتیٰ کہ شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی کو پاکستان تشریف آوری کی زحمت دی گئی تھی جن کا شمار عالم اسلام کے ممتاز اصحاب علم میں ہوتا ہے اور اس مسلسل عوامی اور علمی جدوجہد کے بعد حدود آرڈیننس کا وہ مسودہ تشکیل پایا تھا جسے ایک فوجی آمر کا قانون کہہ کر مسترد کیا جا رہا ہے۔

اس پس منظر میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس ملک میں نافذ کیا جسے بعد میں آٹھویں آئینی ترمیمی بل کی صورت میں منظور کر کے منتخب قومی اسمبلی نے عوامی اعتماد کی سند بھی دے دی اور اس طرح ملک میں حدود شرعیہ کا نفاذ عمل میں لایا گیا لیکن نفاذ کے بعد سے ہی اس پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک کے اندر اور باہر اس کے خلاف اعتراضات اور اس کو ختم کرنے کے مطالبات نے زور پکڑ لیا اور ستائیس برس کے بعد اب یہ مہم اس مقام پر پہنچی ہے کہ مسلسل بین الاقوامی اور داخلی دباؤ کے نتیجے میں تحفظ حقوق نسواں بل کے ذریعے سے اس میں ترامیم کی راہ ہموار کی گئی ہے۔

حدود آرڈیننس پر اعتراضات کیا تھے، اور کن حوالوں سے ان کو ختم کرنے یا ان میں ردوبدل کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، اس کے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم اس تنازعہ کی اصل نوعیت کو نہیں سمجھ سکیں گے اور اس کشمکش کی ماہیت کا ادراک نہیں کر سکیں گے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی حلقوں کو ہمارے اس قانون پر کیا اعتراض ہے اور کیوں ہے؟ سادہ سی بات ہے کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر اپنی مرضی سے اپنے معاشرہ کے لیے کوئی قانون اختیار کرتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق کسی قانون کا نفاذ کرتے ہیں تو اس پر امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور کسی بھی بیرونی ملک یا ادارہ کو پاکستانی عوام کے اس حق میں

مداخلت نہیں کرنی چاہیے لیکن اس کے باوجود امریکہ اس میں مداخلت کر رہا ہے، اقوام متحدہ کو اس قانون کے خاتمہ میں دلچسپی ہے، یورپی یونین اس قانون کو ختم کرنے پر زور دے رہی ہے یا ایمنسٹی انٹرنیشنل حدود آرڈیننس کے خلاف متحرک ہے تو ہمیں اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس اختلاف کے اصل سرچشمہ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ہم اس مداخلت کا راستہ نہیں روک سکیں گے اور اس نوعیت کے اگلے اقدامات کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکیں گے۔ یہاں یہ بات بھی ہمارے علم میں ہونی چاہیے کہ معاملہ صرف حدود آرڈیننس میں چند ترامیم تک محدود نہیں ہے بلکہ اصل ایجنڈا بڑا طویل ہے اور اس کے اہم مراحل اگے آ رہے ہیں۔ بین الاقوامی حلقوں کا مطالبہ حدود قوانین کے حوالہ سے ان ترامیم کا نہیں ہے بلکہ حدود آرڈیننس کو مکمل طور پر ختم کرنے کا ہے اور صرف ان قوانین کو ختم کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے قوانین ان مطالبات کی زد میں ہیں۔ یہ بات بہت سے دوستوں کے ذہن میں تازہ ہوگی کہ امریکی وزارت خارجہ نے پاکستان کے بارے میں اپنی اس سال کی رپورٹ میں صاف طور پر کہا ہے کہ امریکہ پاکستان میں تحفظ ختم نبوت سے متعلقہ قوانین، تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون اور حدود آرڈیننس کے قوانین کو ختم کروانے کے لیے حکومت پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے اور اسلام آباد کا امریکی سفارت خانہ اس سلسلہ میں پاکستان کے ارکان پارلیمنٹ سے مسلسل رابطہ میں ہے۔ یہ خبر روزنامہ پاکستان لاہور نے ۱۷ ستمبر ۲۰۰۶ء کو این این آئی کے حوالہ سے شائع کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدود آرڈیننس میں ابھی مزید ترامیم ہوں گی، گستاخ رسولؐ کے لیے موت کی سزا کا قانون ختم کرنے کی بات ہوگی اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے فیصلے پر بھی نظر ثانی ہوگی، اس لیے یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کو آسانی سے ہضم کر لیا گیا اور اس کے خلاف بھرپور قومی احتجاج منظم نہ کیا جا سکا تو ان دوسرے مراحل کو نہیں روکا جا سکے گا اور دینی حلقے اس مہم میں پسپائی کے سوا اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر پائیں گے۔ خدا کرے کہ ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہو لیکن اسباب کی دنیا میں اس سے مختلف نتیجہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

میرے نزدیک ہمارے شرعی قوانین پر مغربی دنیا اور بین الاقوامی حلقوں کے اعتراضات کی

اصل وجہ یہ ہے کہ مغرب نے اپنے سیکولر فلسفہ حیات، نظام زندگی اور تمدن وثقافت کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی شکل دے کر اور اس پر دنیا کے کم وبیش تمام ممالک سے دستخط لے کر عالمی قوانین کی حیثیت دے رکھی ہے اور اب وہ انسانی حقوق کے نام پر اپنے فلسفہ وتہذیب کو اقوام متحدہ کی چھتری تلے قوت اور دباؤ کے ساتھ دنیا بھر سے منوانے کی کوشش کر رہا ہے اور چونکہ اس مغربی فلسفہ وثقافت کی راہ میں صرف اور صرف اسلامی فلسفہ حیات اور شرعی قوانین ایک مضبوط رکاوٹ ہیں، اس لیے نہ صرف یہ کہ ان کی مخالفت کی جا رہی ہے بلکہ مغرب اور ان کے ہم نواؤں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی اسلامی قانون کو عملاً نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا اور نہ ہی کسی خطے میں کوئی نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہونے دی جائے گی۔ آج کی اصل تہذیبی جنگ یہی ہے اور حدود آرڈیننس کے خلاف سیکولر حلقوں کی مہم اسی عالمی جنگ کا ایک چھوٹا سا پارٹ ہے۔

انہی حدود قوانین کے حوالہ سے دیکھ لیجیے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس میں جسمانی تشدد اور ذہنی اذیت ہو اور توہین وتذلیل کا پہلو ہو۔ گویا کسی بھی جرم کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تینوں باتوں سے خالی ہو اور اگر کسی سزا میں ان میں سے کوئی بات پائی گئی تو وہ انسانی حقوق کے منافی تصور ہوگی۔ اسی بنیاد پر اسلامی سزاؤں کو غیر انسانی اور انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے کہ سنگسار کرنا، کوڑے مارنا، ہاتھ پاؤں کاٹنا، اور برسرِ عام سزا دینا بہرحال جسمانی تشدد اور تذلیل پر مشتمل ہے، اور اگر اقوام متحدہ کے چارٹر میں طے کردہ اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو حدود شرعیہ کی کم وبیش سبھی سزائیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار پاتی ہیں۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بین الاقوامی معاہدہ ہے اور چونکہ ہم اس معاہدہ میں شریک ہیں، ہم نے اس پر دستخط کر رکھے ہیں اور ہم اقوام متحدہ کے نظام کا بھی حصہ ہیں، اس لیے ہمیں اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں سپریم کورٹ میں ایک کیس کے حوالہ سے اس پر بحث ہو چکی ہے اور عدالت عظمیٰ نے اسی اصول پر اس کیس کا فیصلہ کیا تھا کہ انسانی حقوق کا یہ منشور بین الاقوامی معاہدہ ہے اور اس معاہدہ کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی

اس موقع پر کہا گیا تھا کہ انسانی حقوق کا یہ چارٹر آج کا عالمی عرف ہے اور قرآن کریم ہمیں معروفات کی پابندی کا حکم دیتا ہے، اس لیے بھی اس عالمی عرف کی پابندی ہمارے لیے ضروری ہے۔

اس لیے آج اگر امریکہ ہم سے ان قوانین پر نظر ثانی یا ان کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، اقوام متحدہ کے مختلف ادارے ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں، یورپی یونین کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے یا ایمنسٹی انٹرنیشنل واویلا کرتی ہے تو وہ بلاوجہ نہیں ہے اور اس اعتراض، دباؤ یا مطالبہ کی جڑیں اقوام متحدہ کے اس چارٹر کی دفعہ نمبر ۵ میں پیوست ہیں اور اس کے لیے عالمی سطح پر کوئی مضبوط موقف اختیار کیے بغیر ہم اس مخمصے سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے مسلم حکمرانوں یا اداروں میں سے کوئی بھی بین الاقوامی سطح پر یہ مسئلہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہے اور ہم صحیح جگہ پر یہ جنگ لڑنے کی بجائے شاخوں پر الجھ رہے ہیں اور جزئیات پر اپنا وقت اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ میری یادداشت کے مطابق ماضی قریب میں یہ مسئلہ مسلمان حکمرانوں میں سے صرف ملائشیا کے سابق وزیراعظم مہاتیر محمد نے اٹھایا تھا اور اقوام متحدہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر انہوں نے عالم اسلام کے حکمرانوں پر زور دیا تھا کہ وہ متحد ہو کر دو مسئلوں کے لیے اقوام متحدہ پر دباؤ ڈالیں۔ ایک یہ کہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کے سلسلہ میں عالم اسلام کو بھی شریک کیا جائے اور دوسرا یہ کہ انسانی حقوق کے چارٹر پر نظر ثانی کی جائے۔ یہ دونوں باتیں درست اور ضروری ہیں۔ ایک بات سے اقوام متحدہ میں اختیارات کا عدم توازن ختم ہوگا اور عالم اسلام کو اس کا صحیح مقام ملے گا جبکہ دوسری بات نظریاتی اور تہذیبی توازن کا باعث بنے گی، مگر میری معلومات کے مطابق کسی مسلم حکمران نے مہاتیر محمد کی اس بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ آج بھی اس مسئلہ کا حل یہی ہے۔ عالم اسلام کو نہ اقوام متحدہ کے اختیارات اور انتظامی سسٹم میں نمائندگی حاصل ہے اور نہ ہی نظریاتی اور ثقافتی حوالہ سے اسلام اور عالم اسلام کی کسی بات کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے کہ اقوام متحدہ کی سطح پر اسے پوری قوت کے ساتھ اٹھایا جائے اور مسلم ممالک متحد ہو کر اپنے یہ دونوں حق حاصل کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کریں۔

پاکستان کی داخلی صورت حال کے حوالہ سے معروضی تناظر یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان

کے دستور میں جہاں اس امر کی ضمانت دی گئی ہے کہ قرآن وسنت کے قوانین کو نافذ کیا جائے گا اور قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکے گا، وہاں یہ گارنٹی بھی دستور میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ انسانی حقوق کی مکمل پاسداری کی جائے گی اور انسانی حقوق کے چارٹر کے منافی کوئی قانون ملک میں نافذ نہیں ہو سکے گا۔ میرے نزدیک دراصل یہ دو گارنٹیاں ٹکراتی رہتی ہیں۔ جب قرآن وسنت والوں کا زور ہوتا ہے، وہ اپنا کام نکال لیتے ہیں اور کسی وقت انسانی حقوق والے پاور میں آجاتے ہیں تو وہ رخ ادھر کو پھیر لیتے ہیں۔ حدود آرڈیننس اور تحفظ حقوق نسواں بل کے حوالہ سے یہی ہوا ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم پاور میں تھے تو انہوں نے قرآن وسنت والی گارنٹی کو استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور جنرل پرویز مشرف پاور میں ہیں تو وہ انسانی حقوق والی گارنٹی کا ایجنڈا آگے بڑھا رہے ہیں۔

قرآن وسنت کے قوانین ونظام اور انسانی حقوق کے چارٹر میں صرف حدود آرڈیننس کی حد تک تنازعہ نہیں ہے بلکہ اس تنازعہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں خاندانی نظام بھی آتا ہے، عقیدہ اور رائے کی آزادی کے مسائل بھی ہیں، عورت کے معاشرتی مقام کی بات بھی ہے اور دیگر امور بھی ہیں اور اگر تفصیل سے دیکھا جائے تو بیسیوں سیاسی، سماجی، معاشرتی، قانونی اور عمرانی مسائل ہیں جن میں قرآن وسنت کی تعلیمات اور انسانی حقوق کے چارٹر کا آپس میں ٹکراؤ ہے اور اس ٹکراؤ کی ماہیت کو پوری طرح سمجھے اور اس کی نوعیت کا صحیح طور پر ادراک کیے بغیر ہم یہ جنگ مزید نہیں لڑ سکتے۔

یہ تو ہے حدود شرعیہ کی بین الاقوامی مخالفت کا پس منظر جس سے آپ حضرات کو آگاہ کرنا میں بہرحال ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد داخلی صورت حال کی طرف آجائیے۔ پاکستان میں حدود قوانین کی مخالفت کا سلسلہ ان کے نفاذ کے بعد سے جاری ہے اور ملک کے سیکولر حلقوں کے ساتھ سینکڑوں این جی اوز اور انسانی حقوق کے حوالہ سے کام کرنے والی بیسیوں تنظیمیں اس مقصد کے لیے ربع صدی سے متحرک ہیں۔ ان کی اس مہم کا اصل مقصد تو وہی ہے جو بین الاقوامی حلقوں کا ہے اور ملک کے اندرونی سیکولر حلقوں کی جدوجہد کے اہداف مذکورہ بالا بین الاقوامی اہداف سے مختلف

نہیں ہیں، لیکن ان کے اعتراضات میں کچھ داخلی امور بھی ہیں جن میں سے ایک دو کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے وقت یہ کہا جا رہا تھا کہ اس سے جرائم کنٹرول ہوں گے اور معاشرہ میں امن قائم ہوگا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا بلکہ حدود کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا ہے اور قانون شکنی کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ اس معروضی حقیقت سے انکار ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی کسی باشعور شخص کو معروضی حقائق سے انکار کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ہمارے معاشرے میں جرائم کنٹرول نہیں ہوئے بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے اسباب کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے، اس لیے کہ آج کے دور میں ہمارے سامنے یہی قوانین سعودی عرب جرائم میں کنٹرول کرنے کا ذریعہ بنے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ جو حضرات اب سے پون صدی قبل کے سعودی معاشرہ کی صورت حال سے آگاہ ہیں، وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ سعودی عرب کے قیام سے قبل حجاز مقدس میں چوری، قتل، ڈاکہ اور دوسرے جرائم اس قدر عام تھے کہ حج بیت اللہ کے لیے جانے والے لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے بلکہ اس کا نشانہ زیادہ تر وہی بنتے تھے، لیکن شاہ عبدالعزیز آل سعود مرحوم نے سعودی عرب کے قیام کے بعد اس کا اقتدار سنبھالتے ہی شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا اور ان پر موثر عملدرآمد کا اہتمام کیا تو وہاں جرائم پر نہ صرف یہ کہ کنٹرول حاصل ہوا بلکہ جرائم کی شرح کے حوالہ سے سعودی عرب کو آج بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی آج کے دور کی ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ ہمارے پڑوسی افغانستان میں جب طالبان نے زمام اقتدار سنبھالی اور شرعی قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا تو ان کے پانچ سالہ دور میں ان کے دائرہ اختیار میں جرائم کنٹرول ہوئے جسے بین الاقوامی حلقوں میں تسلیم کیا گیا حتیٰ کہ وار لارڈز کے خاتمہ اور پوست کی کاشت پر پابندی کے حوالہ سے طالبان حکومت کی کامیابی کا عالمی اداروں کی باقاعدہ رپورٹوں میں کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ قوانین اگر سعودی عرب میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور افغانستان میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو پاکستان میں ان کے

غیر موثر ہونے کی وجہ کہیں اور تلاش کرنی پڑے گی، اس لیے کہ ایک بیج اگر ایک زمین میں پھل دیتا ہے، دوسری زمین میں بھی پھل دیتا ہے لیکن تیسری زمین میں پھل نہیں دیتا تو قصور بیج کا نہیں گنا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یا تو زمین درست نہیں ہے یا اس میں بیج ڈال کر پانی، کھاد اور گوڈی کا اہتمام کرنے والوں کے عمل میں کوتاہی ہے۔ ہمارے خیال میں فرق کا اصل نکتہ یہ ہے کہ سعودی عرب نے حدود شرعیہ نافذ کر کے ان پر عملدرآمد کے لیے قضا کا شرعی نظام فراہم کیا، اس لیے یہ قوانین کامیاب ہوئے۔ طالبان نے بھی افغانستان میں صرف حدود شرعیہ کے نفاذ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قوانین پر موثر عملدرآمد کے لیے قضائے شرعی کا عدالتی نظام بھی قائم کیا جس کی وجہ سے وہ ان قوانین کے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر ہم نے یہ کیا کہ قوانین تو شریعت اسلامیہ کے نافذ کیے، مگر عدالتی سسٹم وہی پرانا برطانوی نوآبادیاتی دور کا باقی رکھا اور حدود قوانین کو اس سسٹم کے حوالہ کر دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہنڈا کار کے انجن میں سوزوکی کا گیئر بکس فٹ کر دیا جائے یا چاول چھڑنے والی مشین سے گندم پیسنے کا کام لیا جائے۔ ہمارے ہاں اگر حدود قوانین موثر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے جسے تبدیل کیے بغیر کسی بھی اسلامی قانون کے موثر نفاذ کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

حدود قوانین پر دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کا غلط استعمال ہوتا ہے اور بہت سی بے گناہ عورتوں کو پھنسا دیا جاتا ہے، لوگ انتقام میں اور دشمنی میں عورتوں کے نام لکھوا دیتے ہیں اور وہ جیلوں میں بلاوجہ پڑی رہتی ہیں۔ اس حوالہ سے بہت پروپیگنڈا کیا گیا اور کچھ عرصہ قبل ایک آرڈیننس بھی جاری کیا گیا کہ جو عورتیں جیلوں میں ہیں، انہیں رہا کر دیا جائے مگر اس آرڈیننس کے نتیجے میں ملک بھر میں جو عورتیں جیلوں سے رہا کی گئیں، ان میں تیس فیصد بھی ایسی نہیں تھیں جو حدود قوانین کے تحت جیل میں ہوں، لیکن اس کی آڑ میں سب کو رہا کر دیا گیا ہے اور اب صورتحال یہ ہے کہ عورتوں کو کسی بھی جرم میں گرفتار نہ کرنے کی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ بات بجائے خود قابل غور ہے کہ مرد اگر جرم کرتا ہے تو گرفتار ہوگا اور جیل میں بھی جائے گا مگر عورت جرم کرتی ہے تو اسے جیل

میں نہیں بھیجا جائے گا۔ کیا یہ امتیازی قانون نہیں ہے؟ اور کیا عورتوں کو جیل سے مستثنیٰ کر کے جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جا رہا؟ بہرحال حدود قوانین کے خلاف مسلسل یہ پروپیگنڈا جاری ہے کہ ان کا غلط استعمال ہوتا ہے اور اس بات کو ان قوانین کو ختم کرنے یا ان میں ردوبدل کا جواز بنایا جا رہا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی نشری تقریر میں زور دے کر کہا ہے کہ عورتوں پر ۲۷ سال سے یہ ظلم ہو رہا تھا کہ ایک عورت زنا بالجبر کا کیس درج کراتی ہے مگر جس پر اس کا الزام ہے، وہ اس کے خلاف چار گواہ پیش نہیں کر سکتی تو اسے خود گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے حوالہ سے تو زنا کا اعتراف کر ہی لیا ہے۔ صدر صاحب نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے جو حدود آرڈیننس کے تحت پاکستان میں عورتوں پر روا رکھا جا رہا ہے، اس لیے انہوں نے حدود میں ترامیم کو ضروری سمجھا ہے۔ دوسری طرف مولانا محمد تقی عثمانی نے علی الاعلان اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ وفاقی شرعی عدالت کے جج اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ کے رکن کے طور پر سترہ سال تک یہ مقدمات سنتے رہے ہیں، ان سترہ سالوں کے دوران میں ایک کیس بھی اس نوعیت کا ان کے سامنے نہیں آیا جس کی صدر صاحب بات کر رہے ہیں۔ پھر بالفرض اگر پروسیجر کی کسی کمزوری کی وجہ سے اس کا امکان موجود بھی ہے تو اس کا حل قانون کو ختم کرنا نہیں بلکہ پروسیجر کو تبدیل کر کے اس کا سدِ باب کرنا ہے لیکن یہاں سرے سے زنا بالجبر پر شرعی حد کی سزا ہی ختم کر دی گئی ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ حدود قوانین کا غلط استعمال ہوتا رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ کون سا قانون ہمارے ملک کا ایسا ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہوتا؟ قتل اور اقدام قتل کی دفعات ۳۰۲ اور ۳۰۷ کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا پچاس فیصد بھی صحیح استعمال ہو رہا ہے اور ان دفعات کے تحت ملک بھر میں جو لوگ جیلوں میں ہیں، ان کے بارے میں کون گارنٹی دے سکتا ہے کہ ان میں سے پچاس فیصد بھی اصل ملزم ہیں؟ تو کیا ان دفعات کے غلط استعمال کی وجہ سے ۳۰۲ اور ۳۰۷ کی دفعات کو ختم کر دیا جائے گا؟ اور اگر کوئی شخص اس کا مطالبہ کر دے تو کیا کوئی بھی باشعور شہری اس کی حمایت کے لیے تیار ہوگا؟ کسی قانون کے غلط استعمال کا تعلق قانون کے صحیح یا غلط ہونے سے نہیں بلکہ ہمارے معاشرتی رویہ سے ہے، ہمارے بدعنوان معاشرتی مزاج سے ہے۔ ہمارے ہاں ہر قانون کا کسی نہ کسی طرح غلط

استعمال ضرور ہوتا ہے۔ قانون تو قانون ہے، ہمارے ہاں دستور غریب کا یہ حال ہے کہ جب کسی جنرل کا جی چاہتا ہے، اس کے ناک کان مروڑ کر اس کا رخ بدل دیتا ہے اور اسے اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو بے چارے قانون کا کیا قصور ہے اور اس کا کون پرسان حال ہے؟ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کا طریقہ قانون کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ معاشرتی رویے کو تبدیل کرنے کی جدوجہد ہے۔ اس کے بغیر کوئی قانون بھی اس طرح کے غلط استعمال سے نہیں بچ سکتا جس کا الزام مسلسل حدود آرڈیننس کے حوالہ سے دہرایا جارہا ہے اور اسی الزام پر حدود آرڈیننس کا جھٹکا کردیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کے نتیجے میں تحفظ حقوق نسواں بل سامنے آیا ہے جو اب منظوری کے مراحل سے گزر کر ایکٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ بل جب قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اس پر خاصا ہنگامہ کھڑا ہوا اور قومی اسمبلی میں موجود علمائے کرام نے اسے قرآن وسنت کے منافی قرار دیتے ہوئے شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ اس احتجاج کی شدت کو کم کرنے کے لیے حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ کچھ ایسے سرکردہ علمائے کرام سے اس سلسلہ میں رائے لے لی جائے جو سیاسی کشمکش میں فریق نہ ہوں اور خالصتاً علمی اور دینی حوالہ سے اس بل کی خلاف شریعت باتوں کی نشاندہی کردیں۔ چودھری صاحب نے اسمبلی کے فلور پر اعلان کیا کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی دفعہ بھی اس بل میں ہوئی تو اسے تبدیل کیا جائے گا اور قرآن وسنت کے منافی کوئی بل کسی صورت میں منظور نہیں کیا جائے گا، چنانچہ جن علمائے کرام کو سیاسی طور پر غیر جانبدار تصور کرتے ہوئے اس مقصد کے لیے اسلام آباد بلایا گیا، ان میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمٰن اور مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی کے ساتھ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ ہم چودھری شجاعت حسین کی دعوت پر اسلام آباد میں جمع ہوئے اور طویل مذاکرات اور گفت وشنید کے بعد بعض نکات پر ہم متفق ہوگئے۔ ان مذاکرات میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے ساتھ چودھری شجاعت حسین صاحب، چودھری پرویز الٰہی صاحب اس بل کے بارے

میں قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے چیئر مین سردار نصر اللہ دریشک صاحب، وفاقی وزیر قانون وصی ظفر صاحب، وفاقی سیکرٹری اور اٹارنی جنرل کے علاوہ دیگر افسران بھی شریک ہوئے۔ ہم نے اس سلسلہ میں کئی ملاقاتیں کیں اور ایک موقع پر تو ہم صبح ۹ بجے سے نماز اور کھانے کے وقفے کے ساتھ رات تین بجے تک بحث ومباحثہ کرتے رہے جس کے نتیجے میں تین باتوں پر اتفاق رائے ہو گیا۔ ایک یہ کہ اس نئے قانون میں زنا بالجبر کو شرعی حد کے دائرے سے نکال کر تعزیری قانون بنا دیا گیا ہے جو درست نہیں ہے، اس لیے حسب سابق زنا بالجبر پر شرعی حد کی سزا بحال کی جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ زنا بالرضا کے مقدمہ میں زنا کا شرعی ثبوت مکمل نہ ہونے پر اس سے نچلے درجے کے جو جرائم اسی کیس میں ثابت ہو گئے ہیں، ان پر حدود آرڈیننس میں تعزیری سزا رکھی گئی تھی مگر نئے بل میں ان تعزیری سزاؤں کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ تعزیری سزائیں بحال کی جائیں گی، البتہ ان کا عنوان زنا کی بجائے فحاشی میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں طویل بحث ومباحثہ کے بعد ایک نئی دفعہ کا متن طے ہوا جس کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اسے تحفظ حقوق نسواں بل کا حصہ بنایا جائے گا اور تیسری بات یہ کہ حدود آرڈیننس کی اس دفعہ کو نئے مسودہ قانون میں حذف کر دیا گیا تھا کہ کسی دوسرے قانون کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں حدود قوانین کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اس پر ایک نئی دفعہ قانون میں شامل کرنے پر اتفاق ہوا کہ ان قوانین کی تعبیر واطلاق میں قرآن وسنت کی تشریحات کو فوقیت حاصل ہوگی اور اس دفعہ کا متن بھی باہمی اتفاق رائے سے طے ہوا۔ ان کے علاوہ ہم نے اور بھی بہت سی تجاویز دیں جو قومی پریس کے ریکارڈ میں آچکی ہیں مگر مذکورہ تین باتیں صرف ہماری تجاویز نہیں بلکہ متفقہ فیصلہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے کہ اگر ہم نے صرف تجاویز اور رائے دینا ہوتی تو وہ ہم دوسری تجاویز کی طرح لکھ کر حوالہ کر سکتے تھے، لیکن ان تین امور کو طویل مذاکرات کے بعد متفقہ فیصلے کے طور پر تحریر کیا گیا۔ اس پر علمائے کرام کے علاوہ چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی اور سردار نصر اللہ دریشک صاحب نے بھی دستخط کیے اور پھر ان کو چودھری صاحبان نے ہی پریس کے حوالے بھی کیا، لہٰذا ان تین امور کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ علمائے کرام کی تجاویز تھیں جنہیں قبول نہیں کیا گیا بلکہ یہ متفقہ فیصلہ تھا جس سے انحراف کیا گیا ہے اور یہ بہت بڑے

ظلم اور ناانصافی کی بات ہے۔

بہر حال ان مراحل سے گزر کر ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو جس شکل میں قومی اسمبلی اور سینٹ نے منظور کیا ہے اور جس انداز میں صدر جنرل پرویز مشرف نے اس کی منظوری کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیتے ہوئے اس پر دستخط کر کے اسے ایکٹ کی شکل دی ہے، وہ ایک الگ المیہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ قرآن وسنت کے صریح احکام اور علمائے کرام کے ساتھ متفقہ معاہدہ سے انحراف کرنے کے باوجود اس ایکٹ کو قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دیا جا رہا ہے اور ملک بھر کے علمائے کرام کی تحقیر اور کردار کشی کرتے ہوئے قرآن وسنت کی من مانی تشریحات کے ذریعے سے شریعت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

اس پس منظر اور معروضی صورت حال کے تذکرہ کے بعد اب میں آتا ہوں اس بات کی طرف کہ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے سے حدود آرڈیننس میں کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں اور اس نئے قانون کی منظوری کے بعد قانونی صورتحال میں کیا تغیر آیا ہے۔اس سلسلے میں میرے تبصرہ کی بنیاد چار رپورٹیں ہیں جن کی روشنی میں اس قانون کے ذریعے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کر رہا ہوں۔پہلی رپورٹ جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی کا وہ تجزیاتی مضمون ہے جس میں انہوں نے جامعیت اور اختصار کے ساتھ اس ایکٹ کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔دوسری رپورٹ وہ یادداشت ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے سترہ اکابر علمائے کرام نے مشترکہ طور پر چودھری شجاعت حسین صاحب کو مخاطب کیا ہے اور خود ان کے گھر جا کر وہ یادداشت ان کے حوالہ کی ہے۔تیسری رپورٹ سرکردہ اہل حدیث علمائے کرام کا وہ تجزیاتی جائزہ ہے جو قومی اخبارات کے ذریعے سے منظرِ عام پر آ چکا ہے اور چوتھی رپورٹ محترمہ ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی صاحبہ کا تجزیاتی مضمون ہے جو حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی ہمشیرہ ہیں اور جمعیۃ علمائے پاکستان کے شعبہ خواتین کی سربراہ ہیں۔ان رپورٹوں کے حوالہ سے میں ان چند تبدیلیوں کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں جو تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے سے سامنے آئی ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر اس سلسلہ میں سب سے بڑی تبدیلی اور خرابی یہ نظر آتی ہے کہ اس قانون میں

زنا کے علاوہ کوئی اور مسئلہ شامل نہیں ہے مگر اسے عنوان ''حقوق'' کا دیا گیا ہے اور اس طرح زنا کو حقوق کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ بات صدر جنرل مشرف صاحب نے بھی اپنی نشری تقریر میں کہی ہے کہ ہم اس ایکٹ میں زنا کے سوا کسی مسئلہ کو نہیں چھیڑا اور امر واقعہ بھی یہ ہے کہ اس میں زنا ہی کے قوانین بیان کیے گئے ہیں لیکن اسے حقوق کا عنوان دے کر یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں زنا اب جرائم میں نہیں بلکہ حقوق میں شمار ہوگا، اس لیے اس قانون کے حوالہ سے میرا سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ زنا حقوق میں کب سے شامل ہو گیا ہے؟ اس پس منظر میں اس سوال کی سنگینی اور سنجیدگی میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ مغربی دنیا میں زنا حقوق میں شمار ہوتا ہے۔ وہاں انسانی حقوق کے نام سے عورتوں کے اسقاط حمل کے مطلق حق اور ہم جنس پرستوں کی شادیوں کو قانونی تحفظ دینے کے جو مطالبات ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں جو قانون سازی ہو رہی ہے، وہ ''زنا'' کو حقوق میں شامل کرنے کا ہی نتیجہ ہے، جبکہ اسلامی شریعت میں یہ عمل جرائم میں بلکہ سنگین ترین جرائم میں شمار کیا جاتا ہے۔

میرا دوسرا اعتراض اس قانون پر یہ ہے کہ زنا کو حقوق کا عنوان دیا گیا ہے اور حقوق بھی عورتوں کے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا کے سامنے پاکستانی عورت کی یہ تصویر پیش کر رہے ہیں کہ وہ زنا کی سہولت مانگ رہی ہے اور ہمارے معاشرہ میں عورت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے زنا کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہونے چاہییں۔ یہ پاکستانی عورت کی بہت غلط تصویر ہے جو ہم اس قانون کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور واقعہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ پاکستانی عورتوں کی غالب اکثریت عصمت وعفت پر یقین رکھتی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر ان کا پختہ ایمان ہے۔

اس قانون میں ایک بہت بڑی زیادتی یہ کی گئی ہے کہ زنا کی دونوں صورتوں یعنی زنا بالرضا اور زنا بالجبر کو ناقابل دست اندازی پولیس قرار دے دیا گیا ہے جس کی سادہ سی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس طرح پولیس کے عمل دخل کو کم کر دیا گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو پریشان نہ کر سکے لیکن اس ٹیکنیکل تبدیلی کے حقیقی اور عملی نتیجہ کو لوگوں کی نظر سے اوجھل رکھا جا رہا ہے کہ اس طرح زنا کا جرم ریاست

کا جرم نہیں رہا اور محض شکایت کا کیس بن گیا ہے، یعنی اس جرم کے ارتکاب پر ریاست کو کوئی شکایت نہیں ہے، کیونکہ جن جرائم کو ریاست اور سوسائٹی کا جرم تصور کیا جاتا ہے، ان میں مدعی خود ریاست ہوتی ہے اور اس کی طرف سے پولیس اس جرم کے کیس کو ڈیل کرتی ہے۔ پولیس کو اس معاملے میں بے دخل کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ اب زنا ریاست کا جرم نہیں رہا۔ کسی شہری بلکہ متاثرہ فریق کو کوئی شکایت ہے تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور اگر اس جرم کے ارتکاب پر کسی شہری کو اعتراض نہیں ہے تو ریاست کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ بات شرعی اصولوں سے متصادم ہے اس لیے کہ اسلامی شریعت میں زنا صرف حقوق العباد کا جرم نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ کی بھی اس سے خلاف ورزی ہوتی ہے اور یہ صرف افراد کی حق تلفی نہیں بلکہ ریاست کی بھی حق تلفی ہے۔

اس قانون کے ذریعے سے ایک تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ ''زنا بالجبر'' کو حدود کے دائرہ سے نکال کر تعزیری جرم بنا دیا گیا ہے جو صراحتاً حد شرعی کو تبدیل کرنے کی صورت ہے۔

تحفظ حقوق نسواں ایکٹ میں ایک اور ظلم یہ کیا گیا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں عدالت کی طرف سے حتمی فیصلہ سنائے جانے کے بعد اس سزا میں کمی یا معافی کا کسی شخص کو اختیار نہیں ہے مگر اس قانون میں یہ ناجائز اختیار صوبائی حکومت کو دے دیا گیا ہے۔

ایک اور خرابی یہ پیدا کی گئی ہے کہ قذف کے قوانین میں یہ گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ اگر عورت عدالت میں رضاکارانہ طور پر زنا کے جرم کے ارتکاب کا اعتراف بھی کرتی ہے تو وہ سزا سے مستثنیٰ ہوگی۔

ایک اور ٹیکنیکل واردات اس قانون کے ذریعے سے یہ کی گئی ہے کہ بلوغت کی حد سولہ سال کی عمر مقرر کر کے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ نابالغ لڑکی اگر رضامندی کے ساتھ بھی زنا کی مرتکب ہوتی ہے تو اس کے ساتھ زنا کو ''زنا بالجبر'' تصور کیا جائے گا اور لڑکی کو کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سولہ سال کی عمر تک لڑکی پر زنا کا الزام ثابت ہو جانے کے بعد بھی اسے اس جرم میں کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس سے معاشرہ میں بدکاری کے فروغ کی جو صورت حال سامنے آ سکتی ہے، اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی نئے قانون میں یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ اگر خاوند خود اپنی بیوی کے ساتھ جماع میں زبردستی کرتا ہے تو اسے ''زنا بالجبر'' تصور کیا جائے گا۔ میں اس حوالہ سے جبر کی حمایت نہیں کر رہا لیکن اسے اس درجہ کا جرم قرار دینا بھی ناانصافی اور ظلم ہے کہ اس پر ''زنا بالجبر'' کا اطلاق کر دیا جائے اور جن حضرات کو قانون کے غلط استعمال سے بہت زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے، میں ان سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ کیا اس قانون کا غلط استعمال نہیں ہوگا اور کیا ہر خاوند کے سر پر یہ تلوار مستقل طور پر نہیں لٹکی رہے گی کہ اس کی بیوی جب کسی بات پر ناراض ہو، عدالت میں اس کے خلاف ایک درخواست دے کر اسے ''زنا بالجبر'' کے کیس میں جیل بھجوا دے؟

ان کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں میں نے بطور نمونہ صرف چند کا ذکر کیا ہے تا کہ آپ یہ اندازہ کر سکیں کہ اس قانون کو قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دینے کے جو دعوے کیے جا رہے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ اب آخر میں ایک گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہوں اور علمائے کرام اور دینی قیادتوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا دھرا ہے اور یہاں تک جو حالات پہنچے ہیں، ان کی سب سے بڑی وجہ خود ہماری غفلت اور کوتاہیاں ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ میں عورت بہت سے حوالوں سے مظلوم ہے اور اس کے بہت سے شرعی حقوق یہاں دبائے جا رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک دینی حلقوں نے عورتوں کے حقوق بحال کرانے اور ان کی مظلومیت کے حق میں آواز بلند کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے؟ ملک میں جتنے ادارے اور این جی اوز عورتوں کے حقوق کے حوالہ سے کام کر رہی ہیں، کیا ان میں کوئی ایک بھی دینی حلقوں کی نمائندگی کرتی ہے؟ ہم نے خود اتنا بڑا محاذ سیکولر اداروں، حلقوں اور این جی اوز کے حوالے کر رکھا ہے، گزشتہ نصف صدی سے وہ اس شعبہ میں مسلسل کام کر رہی ہیں اور آج جبکہ وہ اپنی نصف صدی کی محنت کو کیش کرا رہی ہیں تو ہمیں تکلیف ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے اس شعبہ میں کیا ہی کیا ہے اور سیکولر این جی اوز کو کارنر کرنے کے لیے ان کے مقابلہ میں ہماری کارکردگی اور جدوجہد کا تناسب کیا ہے؟ ہمیں ان زمینی حقائق کا سامنا کرنا ہوگا اور ان کے منطقی تقاضوں کو سنجیدگی کے ساتھ پورا کرنا ہوگا، ورنہ مجھے کم از کم اس سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگلے

مراحل میں جو اس سے بھی زیادہ سخت ہوں گے، ہم پسپائی اور شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

دوسری گستاخی جو میں ضروری طور پر کرنا چاہ رہا ہوں، یہ ہے کہ خاندانی قوانین اور دیگر شرعی احکام کے حوالہ سے مغرب کے ساتھ ہماری جو فکری، علمی اور ثقافتی کشمکش ہے، اس میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں کا رول کیا ہے؟ اور ہم اس کشمکش کی نوعیت، اس کے دائرہ کار اور مغربی حلقوں کے طریق کار کو سمجھنے اور حالات کے تناظر اور تقاضوں کا صحیح طور پر ادراک حاصل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ مغرب اپنا کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔ اس کے ایجنڈے میں مسلسل پیش رفت کا عمل جاری ہے، اس کا نیٹ ورک مضبوط ہے اور اس کا طریق کار انتہائی سائنٹفک اور مربوط ہے مگر ہمارے کیمپ میں (چند شخصیات کے استثنا کے ساتھ) جذباتی نعروں، سطحی معلومات اور فرسودہ دفاعی ہتھکنڈوں کے سوا کیا ہے؟ ہمارے ہاں تو اس کے بارے میں سوچنے کو بھی وقت کا ضیاع تصور کیا جاتا ہے اور اس طرف توجہ دلانے والے چند سر پھرے لوگ ہمارے حلقوں میں بے وقوف سمجھے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں اس ثقافتی، نظریاتی اور فکری جنگ کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے شیخ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ ترکی میں سیکولرازم کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے علما اور مشائخ کے پاس ان کاموں کے لیے وقت نہیں تھا اور نہ ہی وہ ان باتوں کی کوئی اہمیت سمجھتے تھے۔ خاکم بدہن یوں لگتا ہے کہ شاید ہم نے بھی ترکی کے علما ومشائخ کی طرح خدانخواستہ ایک نئے اتاترک کو راستہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۴ تا ۳۰ دسمبر ۲۰۰۶)

حدود قوانین کی مخالفت

فکری ونظریاتی کشمکش کا جائزہ

حدود آرڈیننس اور سیکولر طبقہ

پاکستان ہیومن رائٹس کمیشن کے سیکرٹری جنرل سید اقبال حیدر صاحب نے ۲۲ جون ۲۰۰۶ کو معاصر قومی اخبار ''ایکسپریس'' کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ ''مذہب کو چھوڑ کر پاکستان میں سیکولرازم نافذ کیا جائے۔'' انھوں نے اس گفتگو میں یہ بھی کہا ہے کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مجرم ''ملا'' ہے اور یہ بات بھی ان کی اسی گفتگو کا حصہ ہے کہ ''حدود آرڈیننس'' ایک جبری قانون ہے جو گن پوائنٹ پر ضیاء الحق مرحوم نے نافذ کیا تھا، اس لیے اسے ختم ہو جانا چاہیے۔

اقبال حیدر صاحب خیر سے سید کہلاتے ہیں اور پاکستان میں ''ہیومن رائٹس'' کے عنوان سے کام کرنے والی ایک معروف تنظیم کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ وہ وفاقی وزیر کے منصب پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ انٹرویو میں ان کے نام کے ساتھ سابق وفاقی وزیر کا لاحقہ دیکھ کر میرے ذہن میں خیال آیا کہ آخر انھوں نے وفاقی وزیر کے منصب کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کوئی حلف بھی تو اٹھایا ہوگا، اس حلف میں انھوں نے کیا کہا ہوگا؟ اس لیے کہ وفاقی وزیر کے منصب کا حلف اٹھاتے ہوئے دستور کی پاسداری اور اس کی حدود میں رہتے ہوئے فرائض سرانجام دینے کا عہد بھی اس میں شامل ہوتا ہے اور پاکستان کے دستور کی بنیاد ہی اسلام پر ہے جو ظاہر بات ہے کہ آج کی معروف اصطلاحات میں مذہب ہی کہلاتا ہے۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مذہب کو چھوڑ دینے کا مطالبہ کرنے والے سید اقبال حیدر صاحب کی مذہب کی بنیاد پر تشکیل پانے والے دستور کی وفاداری کا حلف اٹھاتے ہوئے ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود

رحمہ اللہ تعالیٰ جب پہلی بار ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے تو انھیں ۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت قومی اسمبلی کی رکنیت کا حلف اٹھانا تھا جو ان کے نزدیک اسلام کی دستوری ضروریات وترجیحات کو پورا نہیں کرتا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے حلف میں چند جملوں کا اضافہ کیا تھا جن کا مفہوم یہ ہے کہ ''وہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے دستور کی پاسداری کریں گے اور اس دستور کو اسلامی بنانے کی کوشش کریں گے۔'' الفاظ اس سے مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن مولانا مفتی محمودؒ نے اس حلف میں اپنی طرف سے جو اضافہ کیا تھا، اس کا مفہوم کم وبیش یہی تھا۔

نظریاتی لوگوں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظریہ اور عقیدہ کے خلاف حلف اٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے، اس لیے ظاہر بات ہے کہ سید اقبال حیدر صاحب نے بھی وفاقی وزیر کے منصب کا حلف اٹھاتے ہوئے اسلام کی بات کرنے والے دستور کی وفاداری کا حلف اٹھاتے وقت اس قسم کا کوئی اضافہ ضرور کیا ہوگا کہ وہ اس دستور سے (معاذ اللہ) اسلام کو نکالنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور اسے سیکولر دستور بنانے کے لیے کام کریں گے اور اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تھا اور اس وقت وزارت کے شوق میں انھیں اپنا نظریہ اور عقیدہ یاد نہیں رہا تھا بلکہ انھوں نے دستور کی تمام تر اسلامی دفعات کے سائے میں وزارت کے مزے لوٹے تھے تو غالباً اسے ہی دنیا منافقت اور مفاد پرستی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ تو اپنے نظریے اور عہد پر پکے رہے اور مسلسل کوشش کے ساتھ گیارہ سال کے بعد ۱۹۷۳ء میں دستور کو اسلامی بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے، اس طرح کہ جب وہ ۱۹۶۲ء میں دستور کو اسلامی بنانے کی کوشش کا اعلان کر رہے تھے تو وہ قومی اسمبلی کے صرف ممبر تھے، لیکن جب اس کے ٹھیک گیارہ سال بعد ۱۹۷۳ء میں دستور ساز اسمبلی ملک کے مستقل دستور کی بنیادوں میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے کے ساتھ ساتھ ملک میں مکمل اسلامی قوانین واحکام کے عملی نفاذ اور قرآن وسنت کے منافی قوانین کو بتدریج ختم کرنے کی ضمانت کو شامل کر رہی تھی تو یہی مولانا مفتی محمودؒ دستور ساز اسمبلی میں حزب اختلاف کی قیادت کر رہے تھے اور دستور کی منظوری میں

''بارگیننگ پاور'' ان کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ایک نظریاتی راہ نما کا عہد تھا جو اپنے وعدے پر پکا رہا اور بالآخر اسے پورا کر دکھایا، مگر جب اس پس منظر میں سید اقبال حیدر صاحب کے ''مذہب کو چھوڑ دینے اور ملک کو سیکولر بنانے'' کے عقیدہ اور نظریہ کی طرف دھیان جاتا ہے تو ملک کے نام نہاد ترقی پسندوں اور سیکولرسٹوں کی پوری تاریخ ذہن کی سکرین پر گھوم جاتی ہے کہ ان بے چاروں کو کہاں کہاں اور کیا کیا قلابازیاں کھانی پڑیں اور منافقت اور مفاد پرستی کی کون کون سی ''غلام گردشوں'' کے چکر کاٹنے پڑے۔

ایک دور وہ تھا جب مذہب سے انحراف کی بنیاد پر سیکولر سیاسی فلسفہ کے علمبرداروں کا قبلہ ماسکو اور اس کے بعد ماسکو نواز کابل ہوا کرتا تھا۔ وہ میڈیکل چیک اپ کے لیے ادھر کا رخ کرتے تھے اور وہیں سے راہ نمائی اور بھتہ وصول کیا کرتے تھے، لیکن آج کل ان کا قبلہ واشنگٹن ہے اور وہ سال میں ایک دو بار وہاں کی وزارت خارجہ کے ''جنوبی ایشیا ڈیسک'' کے گرد چکر لگانے کو اپنی سیاسی زندگی اور صحت کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں۔ انھیں پاکستان میں اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لے ہر شرط قبول رہی ہے (ظاہر ہے کہ آئندہ بھی رہے گی)۔ وہ اسلام کے ساتھ وفاداری کا کئی بار اعلان کر چکے ہیں، لیکن جونھی موقع ملا، اسلام سے بے زاری کے اظہار میں بھی انھوں نے دیر نہیں کی۔ سید اقبال حیدر صاحب کا مذکورہ انٹرویو پاکستان کے سیکولر حلقوں کی گزشتہ نصف صدی بلکہ پون صدی کی تاریخ اور کردار کی صدائے بازگشت ہے جس سے صحیح طور پر وہی شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جو جنوبی ایشیا میں گزشتہ پون صدی کے دوران کی نظریاتی کشمکش اور اس کے مختلف کرداروں سے شناسائی رکھتا ہے۔

اقبال حیدر صاحب نے اپنے اس انٹرویو میں ''ملا'' پر بھی کرم فرمائی کی ہے اور یہ پہلی بار نہیں ہوا بلکہ ''ملا'' گزشتہ ڈیڑھ صدی سے اس کرم فرمائی کا ہدف چلا آ رہا ہے۔ اس دوران میں بڑے بڑے ''سید اقبال حیدر'' آئے اور ''ملا'' پر چاند ماری کی مشق کرتے ہوئے ''عروس انجام'' سے ہم کنار ہو گئے۔ آج بھی بہت سے لوگ اس شوق میں اپنے بازوؤں کو تھکانے میں مصروف ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا، لیکن ''ملا'' بھی بڑی ڈھیٹ مٹی سے بنا ہے۔ اس پر ان باتوں کا اثر نہ

کبھی ماضی میں ہوا ہے اور نہ ہی آج کے تابڑ توڑ حملوں میں اسے اپنے پاؤں کی جگہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

سابق صدر محمد ایوب خان مرحوم نے اپنی خودنوشت ''فرینڈز، ناٹ ماسٹرز'' میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے حیرت بھرے انداز میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں سیاسی شکست کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اب یہ ملا کبھی سیاسی میدان میں سر اٹھائے گا، لیکن خدا جانے یہ کس سخت جان مٹی سے بنا ہے کہ اس کے صرف چھ سال بعد وہی ''ملا'' تحریک ختم نبوت کے عنوان سے اسٹیبلشمنٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ سید اقبال حیدر صاحب نے یقیناً فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی یہ خودنوشت پڑھی ہوگی۔ خدا جانے یہ پڑھتے ہوئے ان کے احساسات و تاثرات کیا ہوں گے، لیکن میں تو کبھی کبھی مزہ لینے کے لیے اسے پھر سے پڑھتا ہوں اور بہت ''انجوائے'' کرتا ہوں۔ مجھے سید اقبال حیدر صاحب کے اس ارشاد سے اختلاف نہیں ہے کہ ''ملا'' سب سے بڑا مجرم ہے، البتہ اس حوالے سے تحفظ رکھتا ہوں کہ ملا کس کا مجرم ہے؟ ملا مسلمانوں کا مجرم نہیں ہے، اس لیے کہ جو لوگ آج کسی درجے میں مسلمان ہیں، وہ ملا ہی کی وجہ سے ہے اور انھیں اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہے کہ ان کی مسلمانی اور اسلام، دونوں عالم اسباب میں اس وقت صرف ملا کے دم قدم سے ہیں۔ ہاں، ملا ان لوگوں کا ضرور مجرم ہے جو مذہب کو چھوڑنا چاہ رہے ہیں، لیکن اپنے اندر اس کا حوصلہ نہیں پاتے اور جو سیکولرازم کی منزل کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن اس کے لیے انھیں اسلام کے ساتھ وفاداری کا حلف بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ آج ملا سب سے بڑا مجرم ہے، لیکن مغرب کا جس کے ایجنڈے کی تکمیل میں ملا سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور جس کے فکر و فلسفہ کی مسلسل پیش قدمی ملا کے دروازے پر آ کر ایسی رکی ہے کہ اب اس کو واپسی کے لیے بھی راستہ نہیں مل رہا۔

سید اقبال حیدر صاحب نے ''حدود آرڈیننس'' پر بھی سخت غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس بات پر تلملا رہے ہیں کہ یہ قانون مغرب کے مسلسل دباؤ اور مغرب نواز حلقوں کی چیخ پکار کے باوجود ابھی تک کیوں ختم نہیں ہوا۔ ان کے ساتھ اس غصے اور تلملاہٹ میں اور بھی بہت سے لوگ

شریک ہیں جن کی تلملاہٹ اب دھیرے دھیرے جھنجھلاہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اسے ایک جنرل کا نافذ کردہ آرڈیننس کہہ کر اپنے دل کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ یہ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس آرڈیننس کے پیچھے اصل قوت ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کی عوامی طاقت تھی جس میں بعض رپورٹوں کے مطابق ایک ہزار کے لگ بھگ افراد نے جامِ شہادت نوش کیا اور ایک لاکھ کے قریب کارکن جیلوں میں گئے جبکہ کراچی سے پشاور تک پوری قوم کئی ماہ تک سڑکوں پر رہی۔ اس ہمہ گیر عوامی تحریک کے نتیجے میں صدر ضیاء الحق مرحوم کو دستوری اور قانونی حوالے سے وہ چند اسلامی اقدامات کرنا پڑے جن میں سے ایک یہ ''حدود آرڈیننس'' بھی ہے۔ سید اقبال حیدر صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ''حدود آرڈیننس'' صرف ایک ''شو پیس'' ہے جو صرف دکھانے کے لیے ہے۔ اس کے گرد مروجہ عدالتی نظام کی پیچیدگیوں کا ایسا جال تن دیا گیا ہے کہ اس کی کسی شق پر صحیح طریقے سے عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ربع صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کی کسی دفعہ پر عمل ہوا ہے۔ البتہ مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ حدود آرڈیننس کے صرف شو پیس پر، جس کے عملی دائرے میں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے، سید اقبال حیدر اور ان کے ہم نواؤں کی تلملاہٹ کا یہ حال ہے تو اگر کسی دن ''حدود آرڈیننس'' اصلی حالت میں ملک میں نافذ ہو گیا تو ان بے چاروں کا حشر کیا ہو گا؟

(روزنامہ اسلام، جون ۲۰۰۶)

حدود آرڈیننس: مخالفت کیوں؟

’’حدود آرڈیننس‘‘ ایک بار پھر ملک بھر میں موضوع بحث ہے اور وہ لابیاں از سر نو متحرک نظر آ رہی ہیں جو اس کے نفاذ کے ساتھ ہی اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئیں تھیں اور قومی اور عالمی سطح پر حدود آرڈیننس کے خلاف فضا گرم کرنے میں مسلسل مصروف چلی آ رہی ہیں۔ اس سے قبل ہم اس کالم میں متعدد بار اس مسئلہ کے بارے میں معروضات پیش کر چکے ہیں لیکن موجودہ معروضی صورت حال میں ایک بار پھر اس سوال کا جائزہ لینا ضروری ہو گیا ہے کہ ’’حدود آرڈیننس‘‘ کیا ہے؟ اس کے نفاذ کی مخالفت میں کون کون سے طبقے پیش پیش ہیں اور وہ اس کے خاتمہ کے لیے کیوں سرگرم عمل ہیں؟

’’حدود‘‘ اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے اور حدود کا لفظ ان سزاؤں پر بولا جاتا ہے جو مختلف معاشرتی جرائم میں قرآن وسنت میں طے کی گئی ہیں۔ سزاؤں کا وہ حصہ جس کا تعین اور ان میں کمی بیشی میں اسلامی حکومت، مقننہ اور عدلیہ کو اختیار حاصل ہے، تعزیرات کہلاتا ہے، لیکن چند سزائیں جو طے شدہ ہیں اور جن میں کمی بیشی یا معافی کا حکومت، مقننہ یا عدلیہ میں سے کسی کو شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے، ’’حدود‘‘ کہلاتی ہے۔ مثلاً چوری کی سزا قرآن کریم نے ہاتھ کاٹنا بیان کی ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کریم کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جب کسی عدالت میں کسی شخص پر چوری کا الزام ثابت ہو جائے تو عدالت اس بات کی پابند ہے کہ اسے وہی سزا دے

جو قرآن وسنت نے بیان کی ہے۔ اسے تبدیل کرنے، معاف کرنے یا اس میں لچک پیدا کرنے کا عدالت کو اختیار نہیں ہے۔

ان سزاؤں کے حوالہ سے ''حدود'' کا لفظ یا اصطلاح سب سے پہلے خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کی ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جب بنو مخزوم کی فاطمہؓ کا چوری کا کیس جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور جرم ثابت ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ مخزومیہؓ کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تو اس کے خاندان نے حضرت اسامہ بن زید کو سزا کی معافی کے لیے اپنا سفارشی بنایا۔ اسامہؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کی تو آپ نے سفارش قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اسامہ بن زیدؓ کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ ''کیا اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں تم سفارش کر رہے ہو؟'' اس پس منظر میں ان سزاؤں کو جو قرآن وسنت میں مخصوص جرائم کے لیے طے کر دی گئی ہیں، ''حدود اللہ'' کہا جاتا ہے اور ان کے بہر حال نفاذ کو اسلام کے نظام عدل کا ایک لازمی حصہ تصور کیا جاتا ہے جس کے بغیر نہ اسلامی نظام کا مکمل نفاذ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ جرائم سے پاک ہو سکتا ہے۔

خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حدود اللہ'' قائم کرنے کی تلقین کی ہے اور اس کی برکات سے آگاہ فرمایا ہے، چنانچہ ابن ماجہؒ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے اور نسائیؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کا قائم کرنا لوگوں کے لیے اس بارش سے زیادہ نفع بخش ہے جو چالیس دن تک ضرورت کے مطابق مسلسل چلتی رہے۔''

معاشرتی جرائم کی یہ سزائیں قرآن کریم سے پہلے تورات اور بائبل کے احکام میں بھی شامل رہی ہیں اور اسلام نے ان سزاؤں کو باقی رکھ کر دراصل بائبل کے احکام کے تسلسل کو بحال رکھا ہے، چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک یہودی جوڑا زنا کے جرم میں پیش کیا گیا اور جرم ثابت ہو گیا تو نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم نے توراۃ منگوائی اور اس کے بیان کردہ قانون کے مطابق اس جوڑے کو سنگسار کرا دیا۔ بعد میں مسلمانوں کے متعدد کیس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے انہیں بھی سنگسار کرایا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ افراد کے زنا کے کیس میں سنگسار (رجم) کی سزا کے حوالہ سے توراۃ کے تسلسل کو باقی رکھا ہے اور اسے ہی اسلام کا قانون قرار دیا ہے۔ توراۃ کا یہ حکم آج بھی بائبل میں موجود ہے چنانچہ پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور کی شائع کردہ ''کتاب مقدس'' میں شامل تورات کی کتاب 'استثنا' باب ۲۲ آیت ۲۲ تا ۲۴ میں یہ حکم یوں مذکور ہے:

''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی۔ یوں تو اسرائیل سے ایسی برائی کو دفع کرنا۔ اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پاکر اس سے صحبت کرے تو دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسایہ کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا۔''

اس لیے اگر آج کے عالمی ماحول میں ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزاؤں کو سخت اور معاذ اللہ وحشیانہ قرار دیا جا رہا ہے تو یہ الزام صرف قرآن کریم پر یا شریعت اسلامیہ پر عائد نہیں ہوتا بلکہ بائبل بھی اس ''جرم'' میں برابر کی شریک ہے اور اسے اس میں قرآن کریم پر سبقت حاصل ہے۔

جہاں تک پاکستان میں ان ''حدود اللہ'' کے نفاذ کا تعلق ہے، اس کا مطالبہ تو قیام پاکستان کے وقت سے ہی ہو رہا تھا کہ یہ نفاذ اسلام کا ایک اہم تقاضا تھا لیکن اس کی عملی نوبت جنرل ضیاء الحق شہیدؒ کے دور صدارت میں آئی اور انہوں نے ایک آرڈیننس کی صورت میں اسے ملک میں نافذ کر دیا جو 'حدود آرڈیننس کہلاتا ہے اور مسلسل مخالفت اور اعتراضات کا ہدف ہے۔ اس کی متعدد دفعات کو نہ صرف وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا گیا ہے بلکہ اس کی منسوخی کے لیے قومی اسمبلی

میں باقاعدہ بل لانے کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق شہیدؒ کے نافذ کردہ اس حدود آرڈیننس پر پاکستان میں اور عالمی سطح پر دو طبقوں کو اعتراض ہے اور وہی اس کے خاتمے کے لیے مسلسل تگ ودو کر رہے ہیں۔

ایک طبقہ وہ ہے جو سرے سے ''حدود اللہ'' کے نفاذ کے خلاف ہے۔ وہ چور کا ہاتھ کاٹنے ،زانی کو سنگسار کرنے، جھوٹی تہمت پر کوڑے لگانے، یا قصاص میں عضو کے بدلے عضو کاٹنے کو بھی غلط سمجھتا ہے۔ وہ قرآن کریم کی بیان کردہ سزاؤں کو اس دور کے قبائلی معاشرہ کی ضرورت سمجھتے ہوئے آج کے دور میں ان کے نفاذ کو غیر ضروری بلکہ غلط قرار دیتا ہے اور یہ طبقہ اس معاملہ میں مغرب کے فکر و فلسفہ سے مکمل طور پر متفق اور ہم آہنگ ہے۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو ان حدود کے اسلامی ہونے کا قائل ہے لیکن اسے شکایت ہے کہ ان حدود کی تعبیر وتشریح کے لیے ''حدود آرڈیننس'' مرتب کرنے والوں نے ان حضرات کے موقف اور تعبیرات کو معیار تسلیم کرنے کی بجائے امت مسلمہ کے جمہور فقہائے کرام کی تعبیرات کو کیوں بنیاد بنایا ہے اور حدود شرعیہ بلکہ اسلامی احکام وقوانین کی جدید تعبیر وتشریح کرنے والے ان دانش وروں کے نقطہ نظر کو توجہ کے قابل کیوں نہیں سمجھا؟ اس پر یہ حضرات اس قدر سیخ پا ہیں کہ سرے سے ''حدود آرڈیننس'' کو منسوخ اور ختم کرانے کے لیے پہلے طبقہ کے شانہ بشانہ جا کھڑے ہوئے ہیں، حالانکہ ان حضرات کی یہ شکایت بجائے خود محل نظر ہے اور اپنی تعبیرات کو ہر حال میں امت سے قبول کرانے کے لیے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

گزشتہ دنوں ایسے ہی ایک دوست سے میرا اس مسئلہ پر مکالمہ ہوا۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ کیا حدود کی تعبیر وتشریح میں فقہائے امت کی تعبیرات حرف آخر ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ کی تعبیرات حرف آخر ہیں؟ اس پر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے گزارش کی کہ کسی بھی سلیم العقل اور صاحب انصاف کو یہ صورت حال پیش آجائے کہ ایک طرف امت کے جمہور فقہا کی تعبیرات ہوں اور دوسری طرف چند دانش ور حضرات اپنی تعبیرات کو اس کے مقابلے پر پیش کر رہے ہوں تو ایک انصاف پسند شخص امت کے چودہ سو سالہ تعامل اور تمام دینی وعلمی مکاتب فکر کے جمہور علما کی

اجتماعی تعبیرات کو چند دانش وروں کی آرا پر قربان کرنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہوگا۔ ایسے اصحاب دانش کی حالت انتہائی قابل رحم ہے جو مولوی پر یہ الزام لگاتے نہیں تھکتے کہ وہ ضدی ہے، ہٹ دھرم ہے اور دوسروں کے نقطہ نظر کا احترام نہیں کرتا، لیکن خود ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل اور آج کے جمہور علمائے امت کے اتفاقی موقف کے سامنے چند افراد اس بات پر مصر ہیں کہ قرآن وسنت کے احکام ومسائل میں ان کی تعبیرات وتشریحات کو ہر حال میں قبول کیا جائے اور صرف انہی کو ''معیار حق'' قرار دے کر احادیث نبویہؐ اور فقہ اسلامی کے پورے ذخیرے کو ان کے سامنے ''سرنڈر'' کرا دیا جائے، ورنہ وہ مغرب کے ساتھ ہیں اور سرے سے اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ کو غیر ضروری قرار دینے والوں کی صف میں کھڑے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ حدود آرڈیننس کا وہ حصہ جس کا تعلق تطبیق ونفاذ کی عملی صورتوں سے ہے، حرف آخر نہیں ہے اور موجودہ عدالتی نظام کے پس منظر میں ان میں سے بعض باتوں پر نظر ثانی ہو سکتی ہے، لیکن یہ یک طرفہ بات ہے اس لیے کہ ''حدود'' کے نفاذ کو جس عدالتی نظام کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے، وہ بجائے خود محل نظر ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر سطح اور ماحول چیخ چیخ کر نظر ثانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے جو مشکلات اور شکایات عملی طور پر سامنے آتی ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق آرڈیننس کی بعض شقوں سے ہو سکتا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر شکایات اور مشکلات کا تعلق موجودہ عدالتی سسٹم اور اس کے پیچ در پیچ نظام سے ہے اور یہ شکایات صرف حدود کے حوالے سے نہیں بلکہ ملک کا ہر قانون اس عدالتی سسٹم کی پیچیدگی اور تہہ در تہہ الجھنوں کا نوحہ کناں ہے، مگر ہمارے یہ دانش ور اس سارے ملبہ کو حدود آرڈیننس پر ڈال کر اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہیں۔ کچھ عرصہ قبل توہین رسالتؐ کی سزا کے قانون کے حوالہ سے سوال اٹھا تھا کہ اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے، اس لیے اسے ختم کر دیا جائے۔ ہم نے گزارش کی تھی کہ کون سا قانون ملک میں ایسا ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہو رہا ہے؟ اگر کسی قانون کو ختم کر دینے کے لیے صرف یہی جواز کافی ہو کہ اس کے غلط استعمال ہونے کا امکان موجود ہے تو ملک

کے پورے قانونی نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہوگا اس لیے کہ ملک میں کوئی قانون بھی ایسا نہیں ہے جس کا غلط استعمال نہ ہو رہا ہو اور جس کے غلط استعمال کا امکان موجود نہ ہو، مگر اس کا تعلق قانون سے نہیں بلکہ قانونی نظام اور معاشرتی ماحول سے ہوتا ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں ان حضرات سے کوئی شکوہ نہیں ہے جو اس حوالہ سے مغرب کی نمائندگی کر رہے ہیں اور سرے سے حدود کے نفاذ ہی کے مخالف ہیں اس لیے کہ ان کا موقف واضح ہے، لیکن جو لوگ اسلام کا نام لے کر مغرب کے موقف اور ایجنڈے کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں، ان سے شکوہ کا حق ہم ضرور رکھتے ہیں کیونکہ جسٹس (ر) دراب پٹیل اور عاصمہ جہانگیر کے ساتھ جب ہم محترم جاوید احمد غامدی صاحب اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی کو ایک ہی صف میں کھڑا دیکھتے ہیں تو بہر حال ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۲ جون ۲۰۰۶)

محترم جاوید غامدی اور ڈاکٹر طفیل ہاشمی کی توضیحات

'الشریعہ' کے جولائی ۲۰۰۶ کے ادارتی صفحات میں حدود آرڈیننس پر ملک میں ایک عرصہ سے جاری بحث ومباحثہ کے حوالے سے حدود آرڈیننس پر معترض حلقوں کے موقف پر اظہار خیال کرتے ہوئے راقم الحروف نے اپنے دو محترم دوستوں، محترم جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی کا بھی تذکرہ کیا تھا اور اس بات پر دکھ کا اظہار کیا تھا کہ حدود آرڈیننس کے حوالے سے ان حضرات کا جو موقف پبلک کے سامنے آ رہا ہے، وہ ان حلقوں کی تقویت کا باعث بن رہا ہے جو حدود آرڈیننس کی تکنیکی خامیوں یا فقہی کمزوریوں کو دور کرنے کے بجائے سرے سے پاکستان میں شرعی قوانین کے نفاذ ہی کے خلاف ہیں اور اسی وجہ سے وہ حدود آرڈیننس کو منسوخ کرانے کے درپے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے اس مضمون کا اختتام ان جملوں پر کیا تھا کہ:

> ''جو لوگ اسلام کا نام لے کر مغرب کے موقف اور ایجنڈے کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں، ان سے شکوے کا حق ہم ضرور رکھتے ہیں کیونکہ جسٹس (ر) دراب پٹیل اور عاصمہ جہانگیر کے ساتھ جب ہم محترم جاوید احمد غامدی صاحب اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی کو ایک ہی صف میں کھڑا دیکھتے ہیں تو بہر حال ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔''

مجھے خوشی ہے کہ دونوں بزرگوں نے اس ''تکلیف'' کا نوٹس لیا ہے جس سے میری گزارشات کا ایک مقصد بحمد اللہ تعالیٰ پورا ہو گیا ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ان حضرات کا موقف وہ نہیں ہے جو بعض ذرائع ابلاغ کی مخصوص پلاننگ کی وجہ سے عام حلقوں میں سمجھا جانے

لگا ہے مگر میں یہ چاہتا تھا کہ اس کی وضاحت کسی دوسرے کو نہیں، بلکہ خود ان حضرات کو کرنی چاہیے۔ چنانچہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے اور دونوں حضرات نے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کی ضرورت محسوس فرمائی ہے جس پر میں اپنے ان دونوں بزرگ دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

محترم جاوید احمد غامدی صاحب نے حسب روایت خود کچھ نہیں لکھا مگر ان کے معتمد رفیق کار جناب منظور الحسن نے ماہنامہ ''اشراق'' لاہور کے اگست ۲۰۰۶ کے ادارتی صفحات میں میری گزارشات پر اظہار خیال کیا ہے جو چونکہ جاوید غامدی صاحب کے ترجمان ''اشراق'' کے اداریہ کے طور پر شائع ہوا ہے، اس لیے میں اسے غامدی صاحب کی طرف سے ہی تصور کر رہا ہوں۔

منظور الحسن صاحب ایک صاحب علم، صاحب مطالعہ اور فاضل دوست ہیں اور غامدی صاحب کے زیر سایہ علمی خدمات میں مصروف ہیں، مگر ابھی چند روز قبل ان کے ساتھ یہ المناک سانحہ پیش آیا ہے کہ غامدی صاحب کے علمی مرکز ''المورد'' ماڈل ٹاؤن لاہور کے قریب رات کے اندھیرے میں ان پر فائرنگ ہوئی ہے جس سے شدید زخمی ہو کر وہ ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ اگرچہ حملہ آوروں کا سراغ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا مگر یہ حرکت جس نے بھی کی ہے، انتہائی مذمت کے قابل ہے اور ہم منظور الحسن صاحب کے ساتھ اس المناک سانحہ میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت کاملہ وعاجلہ سے نوازیں اور ان کے حملہ آوروں کو بے نقاب کر کے ان کے قانونی انجام تک پہنچائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

منظور الحسن صاحب کا مذکورہ مضمون اور ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب کا تفصیلی مکتوب گرامی آپ 'الشریعۃ' کے زیر نظر شمارے میں ملاحظہ کر رہے ہیں اور ان دونوں مضامین کی اشاعت سے میرا مقصد ایک حد تک پورا ہو گیا ہے۔

میں ان دنوں مدارس دینیہ کے سالانہ اجتماعات کی وجہ سے مسلسل اسفار میں ہوں، اس لیے ان دونوں مضامین پر تفصیلی گفتگو کا حق کسی اور موقع کے لیے محفوظ رکھتے ہوئے سر دست صرف اس حوالے سے کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب منظور الحسن صاحب نے لکھا ہے اور ڈاکٹر محمد

طفیل ہاشمی صاحب نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کا موقف ان کی کتابوں میں موجود ہے جسے دیکھے بغیر ان کی کسی رائے پر جرح کرنا درست نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ کتابوں کی دنیا پبلک میڈیا کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ پبلک میڈیا میں کتابوں کے حوالے نہیں دیکھے جاتے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کس موقع پر کن لوگوں کے سامنے کون سی بات کہہ رہے ہیں، کون سے تنازعے میں کس فریق کے ساتھ کھڑے ہیں، اور کسی مسئلہ پر عمومی کشمکش کے تناظر میں آپ کی بات کا فائدہ کسے پہنچ رہا ہے۔ گزشتہ دنوں الیکٹرانک میڈیا کے ایک چینل نے حدود آرڈیننس پر جس کج بحثی کا اہتمام کیا، اس کے بارے میں خود ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب کا تاثر یہ ہے کہ:

> ''مجھے افسوس ہوا کہ ایک ٹی وی چینل نے اسے ناپسندیدہ طریقے سے اپنی ناشایستہ مہم کا حصہ بنایا۔''

اس ٹی وی چینل نے ہمارے ان دو محترم بزرگوں کے موقف کو جس انداز سے پیش کیا، ہمارے لیے اصل تکلیف کا باعث وہی تھا اور اگر ان دوستوں کو ہماری یہ تکلیف کسی لابی کے ساتھ ہمدردی یا اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا سبب نظر آتی ہے تو وہ ملک کے کسی شہر میں جا کر کسی گلی میں کھڑے ہو جائیں اور مذکورہ ٹی وی چینل دیکھنے والے آٹھ دس افراد کو روک کر ان سے ان کا تاثر معلوم کریں کہ وہ حدود آرڈیننس کے حوالے سے عاصمہ جہانگیر اور ہمارے ان محترم دوستوں کے موقف میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جہاں تک حدود آرڈیننس کے بارے میں ہمارے موقف کا تعلق ہے تو وہ بھی یہی ہے کہ حدود اللہ جو قرآن وسنت کی طے کردہ ہیں، قطعی طور پر ناقابل ترمیم ہیں اور قیامت تک کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے، مگر حدود سے ہٹ کر حدود آرڈیننس کی باقی تمام باتوں پر نظر ثانی ہو سکتی ہے۔ فقہی مباحث کا دروازہ کھلا ہے اور ضرورت کے مطابق اجتہاد واستنباط کی گنجایش بھی موجود ہے، البتہ اس فرق اور وضاحت کے ساتھ کہ اجتہاد کے اصول وقواعد وہی ہوں گے جو امت مسلمہ کے اجماعی تعامل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد واستنباط کے مسلمہ

قواعد واصول کی نفی کرتے ہوئے نئے اصول وضوابط کا دروازہ کھولنے کو ہم فتنے کا دروازہ سمجھتے ہیں اور گمراہی کا راستہ تصور کرتے ہیں۔

حدود آرڈیننس ہوں یا کوئی بھی مسئلہ اور قانون، مسلمات کے دائرے میں رہتے ہوئے بحث ومباحثہ ہمارے نزدیک نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ وقت کا ایک ناگزیر تقاضا اور ضرورت بھی ہے جس کی طرف ہم روایتی علمی حلقوں کو مسلسل توجہ دلاتے رہتے ہیں اور مختلف حوالوں سے بعض دوستوں کی ناراضی کا خطرہ مول لیتے ہوئے بھی اس کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں، البتہ اس کے ساتھ ہم پورے شعور کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ہماری زبان اور قلم سے کوئی ایسا جملہ نہ نکلنے پائے جو اسلامی تعلیمات کی نفی کرنے والوں اور مسلمان ممالک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا راستہ روکنے والوں کی تقویت کا باعث ہو اور دوسرے دوستوں سے بھی ہمارا یہی تقاضا ہوتا ہے۔

اپنے گھر کے نقشے میں ردوبدل اور ضرورت کے مطابق ترمیم واضافہ کے لیے رائے دینا اور اس کے لیے کوشش کرنا تمام بھائیوں کا یکساں حق ہوتا ہے لیکن اگر دشمن اس گھر پر حملہ آور ہو تو پہلے گھر کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کوشش اسی گھر کے لیے ہوتی ہے جو جیسا کیسا بھی ہے مگر موجود ہے۔ گھر کو دشمن کے حملے کا سامنا ہو تو ترمیم اور ردوبدل کے نقشے نہیں پھیلائے جاتے بلکہ اس کے تحفظ کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے، البتہ کسی دوست کو اسلام پر، اسلامی احکام وقوانین پر، اسلامی ثقافت وتمدن پر، اسلامی اقدار وروایات پر اور مسلمانوں کے اسلامی تشخص وامتیاز پر دشمن کی یلغار کی ہمہ گیری اور سنگینی کا پوری طرح ادراک واحساس نہ ہو تو ہم اس کے لیے اقبال کی زبان میں یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

(ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ، ستمبر ۲۰۰۶)

حدود آرڈیننس اور الطاف حسین کا بیان

حدود آرڈی ننس پر بحث وتمحیص کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ وفاقی وزیر جناب شیر افگن کا یہ بیان سامنے آیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے، پیر کو حقوق نسواں کے تحفظ کا بل جو دراصل حدود آرڈی ننس میں ترمیمات کا بل ہے، بہرصورت منظور کر لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں حکومت اور متحدہ مجلس عمل نے باہمی اتفاق سے عملی سیاست سے تعلق نہ رکھنے والے چند علمائے کرام کو بھی مشاورت میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی کے ساتھ راقم الحروف کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں ۷ر ستمبر کو اسلام آباد میں پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور بعض وفاقی وزرا کے ساتھ ایک اجلاس کر بھی چکے ہیں۔ اس حوالے سے ضروری تفصیلات قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا ابھی موقع نہیں ہے، البتہ گزشتہ روز حدود آرڈیننس کے بارے میں جناب الطاف حسین نے جو کچھ کہا ہے، اس پر کچھ عرض کرنا مناسب خیال کر رہا ہوں۔

حکومتی اتحاد میں شامل اہم جماعت ایم کیو ایم کے سربراہ جناب الطاف حسین کا ایک طویل بیان ۸ر ستمبر کو ایک قومی اخبار میں شائع ہوا ہے، جس میں قرآن وسنت کے بہت سے حوالے دے کر حدود آرڈیننس کو غلط اور قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے تحفظ حقوق نسواں بل کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بیان پڑھ کر مجھے ایک بات کی خوشی ہوئی ہے اور ایک بات افسوس اور صدمے کا باعث بنی ہے۔ خوشی اس بات پر ہوئی ہے کہ محترم الطاف حسین نے اپنے

موقف کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کریم اور بخاری شریف سے استدلال کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ موصوف قرآن کریم کے ساتھ حدیث نبویؐ خاص طور پر بخاری شریف کو بھی استدلال کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور قرآن وسنت دونوں ان کے نزدیک حوالے اور سرچشمے کی حیثیت رکھتے ہیں، ورنہ اس مباحثے میں شریک بہت سے دانش ور بخاری شریف سمیت حدیث کی کسی کتاب کو استدلال کا بنیادی ماخذ تسلیم نہیں کرتے اور قرآن فہمی کا معیار اور طریق کار خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ اپنی جس بات کو چاہیں قرآن کریم کے کھاتے میں ڈال کر حتمی قرار دے سکیں۔ اس کے برعکس حدیث نبویؐ اور بخاری شریف کو استدلال کی بنیاد قرار دے کر ہم اس بات کے پابند ہو جاتے ہیں کہ قرآن کریم کا مفہوم طے کرنے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عمل کو ہی معیار بنائیں اور اس طرح ہم قرآن فہمی کے حقیقی معیار اور اللہ تعالیٰ کی منشا کو حاصل کرنے سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ الطاف حسین کے قلم سے بخاری شریف کو بطور حوالہ دیکھ کر واقعتاً مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے معاملات پر گفتگو کرنا آسان ہو گیا ہے، کیونکہ تعبیر وتشریح کے اصول وضوابط طے ہوں اور طریق کار متعین ہو تو کسی بھی مسئلے پر دونوں طرف کے دلائل سامنے رکھ کر کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں رہتا، لیکن جو دوست قرآن فہمی اور قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے اصول وضوابط بھی خود طے کرتے ہیں اور انہی خود ساختہ اصولوں پر قرآنی احکام کی تشریح وتعبیر کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں، ان کے ساتھ کسی مسئلے پر بات کرنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں ہوتا اور یہ ایک طرح کی ''فری سٹائل کشتی'' ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو تفریح تو فراہم کرتی ہے مگر فن اور طاقت کے حوالے سے کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچاتی۔

البتہ الطاف حسین صاحب کے بیان میں اس بات پر بہت دکھ ہوا کہ ان کی زبان مکالمے اور مباحثے کی نہیں ہے، دھونس اور جبر کی زبان ہے۔ عام طور پر یہ بات ''مولوی'' کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ وہ دھونس کی زبان استعمال کرتا ہے، ہر بات میں دھکا کرتا ہے اور دلیل سے زیادہ دھمکی سے کام لیتا ہے۔ قارئین سے میری گزارش ہے کہ وہ جناب الطاف حسین کے اس بیان کا متن پڑھیں اور یہ فیصلہ کریں کہ کیا دھونس اور دھمکی کی زبان میں پاکستان کا کوئی بھی مولوی

جناب الطاف حسین کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ الطاف حسین صاحب اس وقت پاکستان میں جاگیرداری کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہیں اور ان کی یہ بات بہت سے دیگر تحفظات کے باوجود مجھے اچھی لگتی ہے، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جاگیرداروں اور اجارہ داروں کی مخالفت میں ان کا ذکر زبان پر بار بار آنے سے جناب الطاف حسین کی زبان نے ان کا اثر قبول کر لیا ہے اور لاشعوری طور پر وہ بھی انہی کی زبان اور لہجے میں بات کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اسلامی احکامات اور روایات کی تعبیر و تشریح میں قرآن و سنت کو معیار تسلیم کریں تو ان کے ساتھ ہر مسئلے پر بات ہو سکتی ہے اور ایسا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہ جاتا، جس میں ہم باہم مل بیٹھ کر افہام و تفہیم کے ساتھ کسی متفقہ نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔

اس اصولی گفتگو کے بعد جناب الطاف حسین کے اٹھائے ہوئے نکات میں سے صرف ایک نکتے پر مختصر گفتگو کرنا چاہوں گا کہ وہ رضامندی کے زنا کی صورت میں بھی زانی اور زانیہ کو سزا دینے کی بات سے متفق نہیں ہیں، جبکہ حدود آرڈی ننس میں ایسی صورت کو ''تعزیری زنا'' قرار دیا گیا ہے کہ کسی جوڑے پر زنا کا الزام تو ثابت نہیں ہو سکا، لیکن اس کے قرائن اور دواعی ریکارڈ پر آ گئے ہیں۔ حدود آرڈی ننس کا منشا یہ ہے کہ زنا کی شرعی حد تو چار گواہوں کی صورت میں ہی دی جائے گی، لیکن اگر چار گواہ موجود نہیں ہیں یا ان کی گواہی قبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، مگر زنا سے کم درجے کے جرم کا ثبوت موجود ہے تو اس جوڑے کو بالکل معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے تعزیر کی صورت میں کوئی نہ کوئی سزا ضرور دی جائے گی۔ اس پر ہمارے بہت سے اہل دانش معترض ہیں۔ جناب الطاف حسین کا منشا بھی یہی نظر آتا ہے کہ اگر ''زنا'' ثابت نہیں ہے تو پھر سزا کیسی؟ اور زنا کی کوئی تعزیری سزا قرآن پاک میں مذکور نہیں ہے۔ یہ ایک فنی اور ٹیکنیکل سی بحث ہے جس سے بہت غلط نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے۔

مثال کے طور پر ایک جوڑا جو میاں بیوی نہیں ہیں اور آپس میں محرم بھی نہیں ہیں، کسی ہوٹل میں ایک کمرے میں رات گزارتے ہیں، یا کوئی جوڑا کسی جگہ بوس و کنار کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے اور وہ میاں بیوی نہیں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اتنی بات ان کے زنا کا ثبوت نہیں ہو سکتی اور

وہ شرعی حد کے سزاوار نہیں ہیں، لیکن غیر محرم جوڑے کا ہوٹل کے کمرے میں رات گزارنا یا غیر محرم جوڑے کا کسی جگہ بوس و کنار کرتے ہوئے دیکھا جانا، یہ بھی کوئی جرم ہے یا نہیں؟ حدود آرڈیننس نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس کے لیے ''تعزیری زنا'' کی اصطلاح استعمال کر لی ہے جس کو ٹیکنیکل بنیاد پر بعض دوست رد کر رہے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ یہ اعمال بجائے خود جرم ہیں یا نہیں؟ اور اگر معترضین کی نظر میں بھی یہ اعمال جرم ہیں تو وہ اس کے لیے کوئی سزا تجویز کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہمارے یہ مہربان دوست ان حرکات کو سرے سے جرم ہی تصور نہیں کرتے اور مغربی معاشرے کی طرح پاکستان میں مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط اور برسرِ عام بوس و کنار کا ماحول دیکھنا چاہتے ہیں تو الگ بات ہے، ورنہ اگر یہ باتیں ان کے نزدیک بھی جرم ہیں تو پھر نہ صرف یہ کہ شریعت ایسی حرکات کی اجازت نہیں دیتی، بلکہ اسلامی حکومت کو ایسی حرکات کو کنٹرول کرنے کا پابند بھی بناتی ہے۔ اس لیے صرف اتنی سی بات پر طوفان اٹھا دینا کوئی انصاف کی بات نہیں ہے کہ حدود آرڈی ننس میں ایسی حرکات یا شرعی اصطلاح میں ''دواعی زنا'' یعنی وہ اعمال جو بدکاری اور زنا کا ذریعہ بنتے ہیں کو ''تعزیری زنا'' کہہ دیا گیا ہے۔

چند سال ہوئے، ایک کیس میں کسی جج صاحب نے ایک فیصلہ دیا۔ کیس کی نوعیت یہ تھی کہ ایک لڑکی گھر سے کسی دوست لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ لڑکی کے والدین نے اغوا کا کیس درج کرا دیا۔ یہ لڑکا اور لڑکی دونوں ڈیڑھ دو ماہ تک ہوٹلوں میں گھومتے پھرتے رہے، پھر آپس میں نکاح کرایا اور عدالت میں نکاح نامہ پیش کر دیا جو لڑکی کے گھر سے بھاگنے کے ڈیڑھ ماہ بعد کی تاریخ میں درج ہوا تھا۔ جج صاحب نے یہ فیصلہ دے کر والدین کو خالی ہاتھ واپس بھیج دیا کہ چونکہ لڑکی بالغ ہے اور اس نے اپنی مرضی سے نکاح کیا ہے، اس لیے ان کے نکاح کو تسلیم کیا جاتا ہے اور والدین نے اغوا کا جو کیس درج کرایا ہے، اسے خارج کیا جاتا ہے۔ میں نے اس پر ایک مضمون میں مذکورہ جج صاحب سے سوال کیا کہ اس بات کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے نکاح کر لیں تو شرعاً نکاح ہو جاتا ہے، لیکن اس کیس میں صرف اتنا نہیں ہوا، بلکہ اس نکاح سے پہلے لڑکی غیر محرم لڑکے کے ساتھ بھاگی ہے اور نکاح فارم میں درج تاریخ سے پہلے

تقریباً ڈیڑھ ماہ تک دونوں ہوٹلوں میں گھومتے رہے ہیں۔ میرا سوال یہ تھا کہ جج صاحب نے اس عمل کا کیا نوٹس لیا ہے اور کیا بالغ لڑکی کے نکاح کے اختیار نے اس سارے عمل کو بھی جواز فراہم کر دیا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے یہ دانش ور اس ’’زنا‘‘ کو تو جرم تصور کرتے ہیں جس کا ثبوت چار عینی گواہوں کی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ رضامندی کے زنا میں کوئی جوڑا ایسے کسی ثبوت کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیتا، مگر دواعی زنا (یعنی زنا کا ذریعہ بننے والی حرکات اور اعمال) ان دوستوں کے نزدیک جرم شمار نہیں ہوتے۔ ان کی اس سوچ کو قبول کرنے کا عملی نتیجہ کیا ہوگا، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ رضامندی کے زنا کا تو کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوسکتا اور زنا سے کم درجے کی حرکات کو تعزیرات کی فہرست سے بھی نکال دیا جائے گا تو عملاً زنا ہمارے معاشرے میں جرم ہی نہیں رہے گا اور مغربی معاشرے کی طرح پاکستان میں وہی مناظر دکھائی دینے لگیں گے جو ویسٹرن کلچر کا لازمی حصہ بن چکے ہیں۔

میں اس حوالے سے ایک اور مثال دینا چاہتا ہوں کہ چوری پر شرعی حد ہاتھ کاٹنا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ہوگی کہ عدالت میں کسی ملزم پر چوری کا الزام باضابطہ طور پر ثابت ہو جائے۔ اگر ثبوت مکمل نہیں ہے تو اسے چوری کی شرعی سزا نہیں دی جائے گی۔ ایک شخص کسی کے گھر میں خفیہ طور پر داخل ہوا ہے اور گھر کے اندر سے پکڑا گیا ہے، قرائن یہ بتاتے ہیں کہ وہ چوری کی نیت سے داخل ہوا ہے، لیکن چوری کا ثبوت فراہم نہیں ہوسکا۔ اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا تو یقیناً نہیں ملے گی لیکن کسی کے گھر میں خفیہ طور پر داخل ہونے پر، جس کا ثبوت موجود ہے، اس کو کوئی سزا دی جائے گی یا نہیں؟ اور کیا چوری کا جرم ثابت نہ ہونے پر اس کا اس گھر میں خفیہ طور پر داخل ہونا اور وہاں موجود پایا جانا بھی جائز قرار پا جائے گا؟ محترم جناب الطاف حسین صاحب سے گزارش کروں گا کہ بات دھونس، جبر اور غصے کی نہیں ہے، ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے۔ کسی بھی قانون کو اس کے مقاصد اور نتائج کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ میں حدود آرڈیننس کا دفاع نہیں کر رہا، بلکہ اس میں شامل ’’حدود اللہ‘‘ کے سوا باقی ہر بات پر بحث و تمحیص اور نظر ثانی کی گنجایش تسلیم

کرتا ہوں، لیکن ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو جس انداز سے مرتب کیا گیا ہے، اس کا عملی نتیجہ پاکستانی معاشرے میں ''زنا'' اور ''دواعی زنا'' کا دروازہ کھولنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا، اس لیے اس کی حمایت یا مخالفت میں تکنیکی پہلوؤں پر اس قدر زور دینے کی بجائے اس کے مقاصد اور نتائج کے حوالے سے بھی ضرور غور کرنا چاہیے اور جناب الطاف حسین جیسے راہنماؤں اور دانش وروں کو اس بارے میں غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۶ء)

حدود قوانین کی تعبیر و تشریح
اور اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار

اسلامی حدود اور بین الاقوامی قوانین

اسلامی نظریاتی کونسل نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں ''اسلامی فوج داری قوانین جدید گلوبلائزیشن کے تناظر میں'' کے موضوع پر تین روزہ بین الاقوامی ورک شاپ کا اہتمام کیا جس کے اختتام پر صحافیوں کو بریفنگ دیتے ہوئے کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر پروفیسر خالد مسعود نے بتایا کہ اسلامی قوانین کے بارے میں ملکی و بین الاقوامی افہام وتفہیم کے فروغ کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی تجویز پر اتفاق رائے سے ''بین الاقوامی مشاورتی نیٹ ورک'' کا قیام عمل میں آ چکا ہے اور بہت جلد کونسل کے ارکان مختلف اسلامی اور دیگر اہم ممالک کے دورے کر کے اس نیٹ ورک کو مزید مستحکم بنائیں گے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے اس پریس بریفنگ میں کہا کہ پاکستان میں ستائیس برس قبل حدود قوانین نافذ ہوئے تھے، مگر اس دوران میں ان کی حمایت ومخالفت میں مسلسل بات آگے بڑھتی رہی اور اب اس حوالے سے تین مختلف موقف سامنے ہیں۔ ایک موقف لبرل حلقوں اور حقوق نسواں کی تحریکوں کا ہے کہ ان حدود کے نفاذ کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرا موقف علمائے کرام کی اکثریت اور معاشرہ کے روایت پسند حلقوں کا ہے کہ حدود قوانین پر بحث ومباحثہ ہی قابل برداشت نہیں ہے، جبکہ تیسرا موقف یہ ہے کہ حدود کا ماخذ قرآن وسنت ہی ہیں مگر پاکستان میں ان کے نفاذ کے طریق کار اور حدود قوانین کی دفعہ وار جزئیات پر بحث وتمحیص اور رد وبدل کی گنجایش موجود ہے اور اس پر بات چیت ہو سکتی ہے۔ محترم ڈاکٹر خالد مسعود نے اپنا موقف بھی یہی بتایا ہے کہ حدود قوانین اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی نہیں ہیں اور ان میں

ترامیم پر غور ہوسکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی بیان کردہ حدود اور پاکستان میں ان کی بنیاد پر نافذ ہونے والے قوانین میں فرق کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

سب سے پہلے تو ہم اسلامی نظریاتی کونسل کے اس کردار کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس نے اسلامی قوانین کے حوالے سے مختلف حلقوں میں پائے جانے والے اختلافات کے ماحول میں باہمی افہام وتفہیم کے لیے بحث ومباحثہ کا سلسلہ شروع کیا اور اس میں عالم اسلام اور بین الاقوامی دنیا کے اجتماعی تناظر کو سامنے رکھنے کی ضرورت بھی محسوس کی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور اسے سیاسی گروہ بندی سے ہٹ کر خالصتاً علمی انداز میں آگے بڑھانا ضروری ہے۔

اس کے بعد ہم حدود آرڈیننس یا اسلام کے فوج داری قوانین کے بارے میں ایک اہم اعتراض کا اصولی طور پر جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کی بنیاد پر ان قوانین کی عام طور پر مخالفت ہو رہی ہے اور ان کی منسوخی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ قوانین آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور عالمگیریت کے جدید ماحول میں عالمی قوانین اور نظام سے مطابقت نہیں رکھتے۔

جہاں تک حدود قوانین کے آج کے مروجہ بین الاقوامی قانون کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہونے کا تعلق ہے، یہ امر واقعہ ہے کہ یہ ہم آہنگی اور مطابقت موجود نہیں ہے اور ہمارے خیال میں اس کی موجودگی نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مروجہ بین الاقوامی قوانین اور اسلامی فوج داری قوانین کے مآخذ اور سرچشمے الگ الگ ہیں۔ اسلامی قوانین کا ماخذ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہیں، کیونکہ فوج داری قوانین یا حدود کی جو عملی صورتیں اسلامی شریعت میں بیان کی جاتی ہیں، ان کی بنیاد تورات اور قرآن کریم کی تعلیمات پر ہے جبکہ مروجہ بین الاقوامی قوانین کی بنیاد سوسائٹی کی اجتماعی عقل اور خواہش پر ہے اور ان کا فکری سرچشمہ وحی الٰہی سے بے زاری یا کم از کم لاتعلقی کا فلسفہ ہے۔ اس لیے ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششوں پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ ممکن اور قابل عمل بات نہیں ہے اور اسے ضروری قرار دے کر

اسلامی حدود وقوانین کو مروجہ بین الاقوامی قانونی نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوئی صورت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم خود بھی وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات سے خدانخواستہ دست بردار ہو کر اپنے قانون کے ماخذ کو تبدیل نہیں کر لیتے۔

ہمارے بعض دانش وروں کا یہ خیال ہے کہ اگر قانون کے نفاذ کا طریق کار تبدیل کر لیا جائے اور عدالتی نظام میں مغربی سسٹم کو اپنا کر اسلامی قوانین کی جزئیات میں کچھ ردوبدل کر لیا جائے تو بین الاقوامی قوانین اور اسلامی حدود کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی کا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے اور ایک عملی مثال سے ہم اس کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن کریم میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بیان کیا گیا ہے جو صریح حکم ہے۔ اس پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح عمل کیا ہے اور اس سختی کے ساتھ عمل کیا ہے کہ ایک موقع پر اعلان فرما دیا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ یہ سزا قرآن کریم کے علاوہ تورات اور دیگر سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی موجود ہے، اس لیے یہ بات طے شدہ ہے کہ چور کو جرم ثابت ہونے پر اسلام کی رو سے جو سزا ملے گی، وہ ہاتھ کاٹنے کی صورت میں ہی ہوگی، البتہ اس بات پر بحث وتمحیص کی گنجایش موجود ہے کہ چور کا اطلاق کس شخص پر ہوتا ہے اور کم از کم کتنی مالیت کی چوری پر یہ سزا نافذ ہوگی، چوری کے جرم کا ثبوت کیسے ہوگا اور اس کی دیگر تفصیلات کیا ہوں گی۔ ان سب امور پر گفتگو ہو سکتی ہے، فقہا نے ہر دور میں اس پر بات کی ہے اور ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا ہے، لیکن کسی بھی فارمولے کے مطابق چوری ثابت ہو جانے کے بعد اس کی سزا میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ چور کا ہاتھ کٹے گا اور آج کے بین الاقوامی قانون یا مغرب کے فلسفہ قانون کا اصل اعتراض ہاتھ کٹنے پر ہے، چور کی تعریف یا چوری کے ثبوت کے طریق کار پر نہیں ہے۔ یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ چور کی تعریف بدل دینے یا چوری کے ثبوت کا طریق کار تبدیل کر دینے سے مغرب کا اعتراض ختم ہو جائے گا اور ہمارے قوانین بین الاقوامی قانونی نظام سے ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ ایک لمحہ کے لیے آپ یہ تصور کر لیں کہ ہم نے عدالتی پروسیجر کو مکمل طور پر مغرب کے نظام قانون سے ہم آہنگ کر لیا ہے، چور کی تعریف بدل دی ہے،

شہادت اور ثبوت کے تمام طریقے مغرب کے لے لیے ہیں، لیکن بین الاقوامی قانون کے تحت قرار پانے والے چور کو مغربی نظام اور عدالتوں کے طریق کار کے مطابق جرم ثابت ہونے کے بعد سزا وہی دے رہے ہیں جو قرآن کریم نے بیان کی ہے تو اس سے مغرب کا اعتراض ختم نہیں ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کا اصل اعتراض چور کی تعریف یا چوری کے ثبوت کے طریق کار پر نہیں، بلکہ چور ثابت ہو جانے والے شخص کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دینے پر ہے اور یہ اعتراض اس وقت تک باقی رہے گا جب تک ہم قرآن کریم کے موجودہ حکم سے دست بردار نہیں ہو جاتے یا اسے وہ معنی نہیں پہنا دیتے جو مغرب کی منشا کے مطابق ہیں، خواہ وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے فیصلوں، خلفائے راشدین کے طرز عمل اور امت کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل کی نفی کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوں۔

یا مثلاً زنا کے جرم پر سزا کا مسئلہ دیکھ لیجیے۔ ہمارے ہاں اسلامی قوانین کو آج کے ماحول میں قابل قبول صورت میں پیش کرنے کے لیے اس مسئلہ پر بحث ہوتی ہے کہ رجم شرعی حد ہے یا نہیں، شہادت میں عورت کا درجہ کیا ہے اور جرم کے ثبوت کا طریق کار کیا ہونا چاہیے۔ ہمارے بعض دانش وروں کا خیال ہے کہ رجم کو شرعی حد کے زمرہ سے خارج کر دیں گے یا عورت کی گواہی کو آج کے مروجہ عالمی معیار پر لے آئیں گے یا جرم کے ثبوت کے لیے مغرب کے عدالتی سسٹم کو اپنا لیں گے تو زنا کی قرآنی سزا پر مغرب کا اعتراض ختم ہو جائے گا۔ یہ خوش فہمی کی بات ہے، اس لیے کہ مغرب کا اصل اعتراض ان باتوں پر نہیں، بلکہ سرے سے زنا کے جرم قرار دیے جانے پر ہے، اس لیے کہ رضامندی کا زنا مغرب کے نزدیک سرے سے جرم ہی نہیں ہے۔ مغرب کے ہاں زنا میں صرف جبر کا پہلو جرم کے ذیل میں آتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جرم کا تعلق زنا سے نہیں، صرف جبر سے ہے۔ اب اگر آپ ایک لمحہ کے لیے رجم کو حدود کی فہرست سے نکال دیتے ہیں اور جرم کے ثبوت کے لیے تمام طریق کار تبدیل کر لیتے ہیں، لیکن رضامندی کے ساتھ باہمی جنسی تعلق قائم کرنے والے غیر شادی شدہ جوڑے کو قرآن کریم کے حکم کے مطابق سو کوڑے مارتے ہیں تو مغرب کا اعتراض پھر بھی باقی رہے گا اور بین الاقوامی قوانین سے ہم آہنگ نہ ہونے کا سوال پھر بھی قائم

رہے گا۔

ہمیں حدود آرڈیننس کی موجودہ ہیئت پر اصرار نہیں ہے۔ ہم قرآن کریم کی بیان کردہ حدود اور ان پر عمل درآمد کے لیے بنائے جانے والے قوانین کے درمیان فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں اور انسانی ذہنوں کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط میں غلطی کے امکان اور ردوبدل کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، مگر یہ بات بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا اور یہ ساری ورزش کرنے کے بعد بھی مغرب کے اعتراضات اور بین الاقوامی قوانین سے ہم آہنگ نہ ہونے کا مسئلہ جوں کا توں موجود رہے گا، اس لیے اس حوالے سے اصل ضرورت بنیادی سوچ میں تبدیلی لانے کی ہے۔ بین الاقوامی قوانین اور مغرب کے ساتھ افہام وتفہیم کی ضرورت سے انکار نہیں، لیکن اس کے لیے اسلامی قوانین میں ردوبدل کر کے اسے مغرب کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی نہیں، بلکہ مغرب کو اس کے قانونی نظام کی خامیوں سے آگاہ کرنے اور بین الاقوامی قوانین کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپس لانے کی محنت کی ضرورت ہے اور ہمارے خیال میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے تحت قائم ہونے والی ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کا اصل آئینی کردار یہی بنتا ہے۔

(ماہنامہ 'اشراق' لاہور، جولائی ۲۰۰۵)

اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ پر چند گزارشات

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئر مین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے حدود آرڈیننس کے بارے میں کونسل کی نئی عبوری رپورٹ اخبارات کے لیے جاری کردی ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حدود آرڈیننس میں ترامیم سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس پر تفصیلی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس رپورٹ کو ہم نے نئی اس لیے کہا ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے قبل بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے اس پر غور کیا تھا اور ایک تفصیلی رپورٹ دی تھی جسے اس آرڈیننس کی تدوین میں بنیاد بنایا گیا تھا، لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کے بعد اس رپورٹ پر قناعت کی بجائے ایک نئی رپورٹ پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور اس حوالہ سے عبوری رپورٹ، کونسل کے نئے چیئر مین نے گزشتہ روز جاری کردی ہے۔ اخبارات میں اس کے بارے میں ڈاکٹر خالد مسعود کے حوالے سے جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں، ان کے مطابق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

☆ موجودہ نافذ شدہ حدود آرڈیننس کس طرح بھی قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے۔

☆ چند ترامیم سے بات نہیں بنے گی، بلکہ اس پر تفصیلی نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اسے نہ صرف قرآن وسنت کے مطابق بنایا جاسکے بلکہ جدید عدالتی نظام میں بھی اسے موثر بنایا جاسکے۔

☆ حدود آرڈیننس میں حدود کی تعریف وتشریح ''فقہی تعریف'' کے تحت کی گئی ہے جبکہ ان کی قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح طور پر تشریح کرنا ضروری ہے۔

☆ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے جرائم میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہوا ہے۔

☆اگر اس آرڈیننس میں عبوری ترامیم لائی جاتی ہیں تو اس سے قرآن وسنت کی روح پر پوری طرح عملدرآمد ممکن نہیں ہوگا۔

ہم ان میں سے ایک دو نکات پر کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے حدود آرڈیننس کو قرآن وسنت کے منافی قرار دینے کی بات ہے، اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ چونکہ حدود آرڈیننس میں حدود کی تعریف اور قوانین کی ترتیب میں فقہی تشریحات وتعبیرات کو بنیاد بنایا گیا ہے، اس لیے وہ قرآن وسنت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ گویا قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل نے فقہ اسلامی اور فقہاے اسلام کی تعبیرات وتشریحات کو قرآن وسنت سے الگ اور منافی قرار دے دیا ہے جو ایک بڑا مغالطہ اور بہت بڑی گمراہی کی بات ہے، اس لیے کہ فقہ اسلامی قرآن وسنت کے مقابل کوئی درآمدی سسٹم نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت ہی سے مستنبط احکام وقوانین کا نام ہے جو مختلف ادوار میں فقہاے اسلام نے مستنبط کیے ہیں اور انہیں ہر دور میں قرآن وسنت کی قانونی تشریح کا درجہ حاصل رہا ہے، مگر یہ ہمارے جدید دانش وروں کی ستم ظریفی ہے کہ وہ برطانوی دور کے نوآبادیاتی عدالتی نظام وقوانین کو تو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں اور اسے قرآن وسنت کے نفاذ کی بنیاد بنانے کے خواہش مند ہیں جو خالصتاً ایک درآمدی سسٹم ہے جسے برطانوی استعمار نے اپنے نوآبادیاتی مقاصد کے لیے سمندر پار سے درآمد کر کے ہمارے ہاں نافذ کیا تھا اور جو ابھی تک ہمارے عدالتی نظام میں نوآبادیاتی ماحول اور مزاج کو باقی رکھے ہوئے ہے، لیکن خود قرآن وسنت سے مستنبط کیے جانے والے قوانین واحکام کو ''فقہی تعبیر'' قرار دے کر انہیں قرآن وسنت کے منافی بلکہ ان سے متصادم قرار دینے کے درپے ہیں، حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ پرانی فقہی تعبیرات وتشریحات کو مسترد کر کے وہ اپنی طرف سے قرآن وسنت کی روشنی میں جو نئی تعریفات اور تشریحات طے کریں گے، ان کا غلط اور صحیح ہونا اپنی جگہ پر، لیکن وہ بھی ''فقہی تعبیرات'' ہی ہوں گی کیونکہ قرآن پاک اور سنت میں کسی جگہ بھی حدود شرعیہ کی ایسی قانونی تعریف متعین نہیں کی گئی ہے جس کی ڈاکٹر خالد مسعود کو تلاش ہے۔ یہ تعریف جو بھی طے کرے گا، قرآن وسنت سے استنباط

کر کے کرے گا اور وہ فقہی تعریف وتعبیر ہی کہلائے گا، البتہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب قدیم فقہا کی تشریحات واستنباطات کی نفی کر کے اور حدود کی نئی قانونی تعریف طے کر کے اسے حدود آرڈیننس کی بنیاد بنانے کا مطالبہ کریں گے تو گویا وہ عملاً اس بات کا تقاضا کر رہے ہوں گے کہ حدود قوانین کی تعبیر وتشریح میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر فقہائے اسلام کی تعبیرات وتشریحات کو بنیاد بنانے کی بجائے امام جاوید اقبال، امام خالد مسعود اور امام جاوید غامدی کی تعبیرات وتشریحات کو معیار قرار دیا جائے، لیکن یہ بات کہنے کا حوصلہ اور اخلاقی جرات نہ رکھتے ہوئے وہ اسے اس گمراہ کن تعبیر کی صورت میں پیش کر رہے ہیں کہ چونکہ حدود آرڈیننس میں تعریفات وتعبیرات کے حوالے سے فقہ کو بنیاد بنایا گیا ہے، اس لیے وہ قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بات قرآن وسنت یا فقہی تعبیرات کی نہیں ہے بلکہ فقہ اسلامی کے چودہ سو سالہ علمی ذخیرے کی نفی کر کے اس کے مقابل نئی فقہ تشکیل دینے کی ہے کیونکہ جن احکام وقوانین کو اسلامی نظریاتی کونسل میں بیٹھ کر ڈاکٹر خالد مسعود صاحب، جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے رفقا طے کریں گے، وہ بھی فقہ ہی کہلائے گی اور اسے صرف اس لیے قرآن وسنت کا درجہ حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ان کے رفقا کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ اس پس منظر میں ہم ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے یہ گزارش کریں گے کہ وہ اپنی تعبیرات اور سوچ کو قرآن وسنت کا درجہ دینے کی بجائے اخلاقی جرات سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو اصل بات بتائیں کہ وہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے فقہا کی فقہوں کی نفی کرتے ہوئے ان کے مقابل ایک نئی فقہ مرتب کرنا چاہ رہے ہیں، اس لیے امت کو چاہیے کہ وہ چودہ سو سالہ فقہی ذخیرے سے دستبردار ہو کر ان نئے اماموں اور ان کی جدید فقہ کے سامنے سرنڈر کر دے۔

ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے اس عبوری رپورٹ میں یہ بھی کہا ہے کہ حدود آرڈیننس کے نافذ ہونے کے بعد ملک میں حدود سے متعلقہ جرائم میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہوا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں اعداد وشمار بھی پیش کیے ہیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس بات کی تائید کرتے ہیں

اور ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد جرائم میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب محترم سے ہمارا سوال یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ان پر عملدرآمد کب ہوا ہے؟ اور کیا موجودہ عدالتی سسٹم میں ان حدود یا کسی بھی شرعی قانون پر عملدرآمد ممکن ہے؟ ڈاکٹر صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ معاشرے میں حدود شرعیہ کے نفاذ کے ثمرآور نہ ہونے کی اصل وجہ حدود کے قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے، کیونکہ حدود آرڈیننس کو نوآبادیاتی عدالتی سسٹم کی پیچیدگیوں میں اس طرح الجھا دیا گیا ہے کہ اس کی کسی ایک دفعہ پر بھی عمل ممکن نہیں رہا، ورنہ یہی حدود شرعیہ سعودی عرب میں بھی نافذ ہیں اور ان کے ذریعے سے وہاں جرائم کنٹرول میں ہیں۔ ہماری ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے گزارش ہے کہ جس طرح انہوں نے حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ کے حوالہ سے پاکستان کی صورت حال پر اعداد وشمار پیش کیے ہیں، اسی طرح تقابلی طور پر سعودی عرب میں حدود شرعیہ کے نفاذ سے قبل جرائم کی صورت حال اور ان کے نفاذ کے بعد سے اب تک جرائم کی شرح کے بارے میں بھی اعداد وشمار کی ایک رپورٹ مرتب کرائیں تاکہ پاکستان کے عوام اس فرق کی وجہ جان سکیں کہ شرعی حدود جب سعودی عرب میں نافذ ہوتی ہیں تو صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ قوانین جرائم میں کمی اور کنٹرول کا ذریعہ بنتے ہیں، لیکن وہی حدود پاکستان میں نافذ ہوتی ہیں تو جرائم میں کمی کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ پھر حدود شرعیہ کے لیے قوانین ہمارے پڑوسی افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دور میں نافذ ہوئے تھے تو وہ بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق جرائم میں کمی اور کنٹرول کا باعث بنے تھے۔ اگر اس کے بارے میں ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو براہ راست معلومات نہ ہوں تو محترم جاوید اقبال صاحب سے دریافت کرلیں جو طالبان کے دور میں خود افغانستان گئے تھے اور واپسی پر انہوں نے قومی پریس کے ذریعے سے اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ طالبان کی حکومت میں شرعی قوانین پر عمل ہو رہا ہے اور ان کے ثمرات ونتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔

حدود آرڈیننس کو موجودہ عالمی عدالتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بات بھی خوب ہے۔ اگر پاکستان کو آج کے عالمی عدالتی نظام اور قوانین کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہونا تھا تو پھر اس

کے لیے الگ ملک کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور یہ کام متحدہ ہندوستان میں زیادہ بہتر طور پر ہوسکتا تھا، مگر تحریک پاکستان کے قائدین بالخصوص قائداعظم محمد علی جناحؒ نے واضح طور پر کہا تھا کہ پاکستان اسلامی قوانین کے نفاذ اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے بنایا جا رہا ہے اور اگر اس مقصد کو الگ کر دیا جائے تو ایک الگ ملک کے طور پر پاکستان کے الگ وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ پھر حدود آرڈیننس ہی کے پس منظر میں ہم ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے سوال کرنا چاہیں گے کہ مروجہ عالمی عدالتی نظام اور قوانین تو رضامندی کے زنا کو سرے سے جرم ہی تصور نہیں کرتے، ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں اور شادی کے بغیر مرد اور عورت کے اکٹھے رہنے اور جنسی تعلقات قائم کرنے کو قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ کیا ڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ان کے رفقا اسی عالمی عدالتی نظام اور قوانین کے لیے قرآن وسنت کی چودہ سو سالہ فقہی تعبیرات کو کند چھری سے ذبح کر دینا چاہتے ہیں؟

(روزنامہ اسلام، ۷/اگست ۲۰۰۶)

تحفظ نسواں بل اور اسلامی نظریاتی کونسل

اسلامی نظریاتی کونسل نے گزشتہ روز جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت اجلاس میں ''تحفظ نسواں بل'' کی حمایت کی ہے اور اسے عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی طرف اہم قدم قرار دیا ہے جبکہ اس سے قبل کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود نے ایک بیان میں بتایا تھا کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے کوئی باقاعدہ رائے قائم نہیں کی البتہ انہوں نے اور کونسل کے بعض ارکان نے ذاتی طور پر صدر جنرل پرویز مشرف کو اس بل کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اس نوعیت کی کوئی خبر اخبارات میں نہیں آئی کہ حکومت نے تحفظ حقوق نسواں بل اسلامی نظریاتی کونسل کو رائے کے لیے بھجوایا ہے یا اسلامی نظریاتی کونسل نے اس بل پر غور کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ اجلاس منعقد کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سارے خلا کو پر کرنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کا اجلاس براہ راست صدر جنرل پرویز مشرف کی صدارت میں منعقد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، لیکن کیا اس طرح کونسل کسی مسئلے کے لیے رائے دینے کے حوالے سے ان اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو ''کور'' کر سکے گی جو آئینی اور قانونی طور پر عمل کے لیے ضروری ہیں؟ ہمارے خیال میں کونسل نے یہ طرز عمل اختیار کر کے اپنی پوزیشن کو مزید مشکوک بنا لیا ہے کیونکہ کونسل میں جو چند ارکان علمائے دین ہیں، وہ پہلے ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں اور جو باقی ہیں، انہیں بل پر معمول کے مطابق غور کرنے کا موقع دیے بغیر صدر مملکت کے سامنے بٹھا کر ان کی تائید حاصل کر لی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاوید احمد غامدی صاحب

کو یہ وضاحت جاری کرنا پڑی ہے کہ وہ کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو چکے ہیں لیکن چونکہ ان کا استعفا ابھی منظور نہیں ہوا، اس لیے وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے اس اجلاس میں شریک ہوئے ہیں جو صدر جنرل پرویز مشرف کی صدارت میں منعقد ہوا ہے، البتہ انہوں نے اجلاس کے دوران تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ گویا اجلاس میں ان کی شرکت کا تعلق بل سے نہیں بلکہ جنرل مشرف کی صدارت سے تھا، اس لیے وہ اجلاس میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر واپس آ گئے ہیں۔

اس پس منظر میں تحفظ حقوق نسواں بل کی حمایت میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے کو حکمران طبقہ اپنے لیے مفید سمجھ رہا ہے تو اسے اس سمجھنے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمارے خیال میں اس مشکوک حمایت نے حکومت کے موقف کو پہلے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رائے اور سفارشات کو ایک نظر دیکھ لیا جائے جو ''حدود آرڈیننس'' کا مسودہ طے کرنے کے لیے کونسل نے ۱۹۷۹ء میں پیش کی تھیں تو دونوں مواقع کا فرق واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے طویل اجلاسوں میں مسودہ قانون کی ایک ایک شق پر تفصیلی غور کیا تھا، ملک کے سرکردہ علمائے کرام اور ماہرین قانون سے مشاورت کا اہتمام کیا تھا اور دیگر مسلم ممالک کے علمائے کرام، بالخصوص شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی کو بھی پاکستان تشریف آوری کی زحمت دی گئی تھی اور طویل بحث ومباحثہ کے بعد ان سفارشات کی منظوری دی گئی تھی جن پر حدود آرڈی ننس کی بنیاد رکھی گئی تھی مگر موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے ان سارے مراحل سے گزرنے کی زحمت سے بچا لیا گیا ہے اور ''سلوک'' کے سارے منازل ''قرب'' کی ایک ہی جست میں طے کر کے تحفظ حقوق نسواں بل کو سند جواز فراہم کر دی گئی ہے۔

ہم ارباب فکر و دانش کو دعوت دیتے ہیں کہ ان دونوں مواقع یعنی ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس کے مسودہ کی ترتیب کے لیے اس وقت کی اسلامی نظریاتی کونسل کی علمی وفقہی تگ ودو اور تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سنجیدگی اور

محنت کا موازنہ کر لیں، اس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ حدود آرڈیننس کی بنیاد کس قدر سنجیدہ علمی محنت پر تھی اور تحفظ حقوق نسواں بل کے لیے بحث ومباحثہ اور تحقیق وتجزیہ کی کیا صورت اختیار کی گئی ہے۔

بہر حال اسلامی نظریاتی کونسل نے تحفظ حقوق نسواں بل کو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی طرف اہم قدم قرار دے کر اپنی رائے دے دی ہے جبکہ دوسری طرف ملک کے تمام دینی حلقے اور علمی مراکز دوسری طرف کھڑے ہیں۔اس وقت پاکستان میں دینی اور علمی طور پر چار مکاتب فکر تسلیم کیے جاتے ہیں: دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع۔حکومت بھی جب کسی مسئلہ پر اہل دین کی رائے چاہتی ہے تو ان مکاتب فکر کو مسلمہ قرار دے کر ان کی نمائندگی کا اہتمام کرتی ہے اور پرائیویٹ طور پر بھی جب کسی مسئلہ پر اجتماعی دینی رائے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان مکاتب فکر کی نمائندگی کو ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ان مکاتب فکر کی مسلمہ اور معروف علمی ودینی قیادتیں موجود ہیں جن پر امت دینی معاملات میں اعتماد کرتی ہے اور جب کسی مسئلہ پر ان مکاتب فکر کے ذمہ دار رہنما مل بیٹھ کر کوئی رائے دے دیتے ہیں تو اسے دینی حلقوں کی اجتماعی رائے سمجھا جاتا ہے اور جب ان مکاتب فکر کے رہنما کسی مسئلہ پر متحد ہوتے ہیں تو قوم یہ تصور کر لیتی ہے کہ دینی حلقے متحد ہو گئے ہیں۔ان زمینی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو صورت حال یہ ہے کہ ان مکاتب فکر کی علمی ودینی قیادتیں الگ الگ طور پر بھی اور مجتمع ہو کر بھی واضح رائے دے چکی ہیں کہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' اپنے مقاصد اور بعض مشتملات دونوں حوالوں سے قرآن وسنت سے متصادم ہے اور اس پر ہر مکتبہ فکر کے ممتاز اہل علم کی تفصیلی نگارشات اخبارات میں قوم کے سامنے آ چکی ہیں۔۲۷ر نومبر کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں سب مکاتب فکر کے قائدین نے جمع ہو کر اجتماعی طور پر یہ رائے دی ہے جبکہ جامعہ نعیمہ لاہور کے اجتماع میں بریلوی مکاتب فکر کے زعما نے اس رائے کی تائید کی ہے اور اہل حدیث مکتب فکر کے ممتاز علمی شخصیات نے تحفظ حقوق نسواں بل کا بالتفصیل تنقیدی جائزہ لے کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔اہل تشیع کے علمی رہنماؤں نے جامعہ اشرفیہ لاہور کے کنونشن میں بھر پور وفد کی صورت میں شریک ہو کر اس اجتماعیت کی حمایت کی ہے

اور الگ طور پر بھی وہ اس موقف کی مسلسل تائید کر رہے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ صورتحال کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ پورے ملک کے اہل دین ایک طرف ہیں اور حکومت اپنے بل اور موقف کی حمایت میں کسی معروف اور مسلمہ مذہبی مکتب فکر کی کسی ممتاز شخصیت کو سامنے نہیں لا سکی اور ایسے دانشوروں کا سہارا تلاش کر رہی ہے جو قرآن وسنت کو من مانی تشریحات کے ذریعے سے حکمرانوں کے معانی پہنا کر انہیں یہ تسلی دے سکیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ قرآن وسنت کے منشا کے مطابق ہے اور ملک بھر کے علمائے کرام بلاوجہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں اس صورتحال کا اکبر بادشاہ کے دور سے موازنہ کر لیا جائے تو اسے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کو بھی یہ خیال سوجھا تھا کہ دین وشریعت کی پرانی تعبیر وتشریح کو ختم کر کے ایسی نئی تعبیر وتشریح اختیار کی جائے جو مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے لیے بھی قابل قبول ہو اور دین کے تصور کو محدود رکھنے کی بجائے وسیع تر مفہوم میں پیش کیا جائے۔ مغل اعظم نے اپنے اس خیال کو عملی اور قانونی شکل بھی دے دی تھی اور اسی نوعیت کی بہت سی اصلاحات حکومتی طاقت کے زور سے نافذ کر دی تھیں جس طرح کی اصلاحات اب روشن خیالی کے عنوان سے لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ارباب علم ودانش اگر آج کی روشن خیالی کے عملی ایجنڈے اور جلال الدین اکبر کی اصلاحات کا موازنہ کریں تو انہیں کچھ زیادہ فرق دکھائی نہیں دے گا۔ ان اصلاحات کو حکومتی طاقت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور طاقت کے بل پر انہیں نافذ کیا گیا تھا، لیکن چونکہ عام مسلمانوں کے معتقدات اور دینی رجحانات سے ان اصلاحات کی مطابقت نہیں تھی، اس لیے جلال الدین اکبر کے تمام تر جاہ وجلال اور حکومت وقانون کی تمام تر قوت کے باوجود اکبر بادشاہ کی یہ اصلاحات ایک نسل سے آگے نہ بڑھ سکیں اور ایک مرد درویش حضرت مجدد الف ثانی کی قیادت میں علمائے حق کی جدوجہد کے سامنے اکبر کے دین الٰہی کو سپر انداز ہونا پڑا تھا۔ دینی علم رکھنے والے بہت سے دانشور اکبر بادشاہ کے ساتھ بھی تھے جنہیں اس کے درباری ہونے کا شرف حاصل تھا اور وہ اکبر بادشاہ کی اصلاحات کو درست ثابت کرنے کے لیے اس طرح کے دلائل اور تاویلات پیش کیا کرتے تھے لیکن ایسی باتوں کی عمر زیادہ

نہیں ہوتی۔ پانی میں زور سے پتھر پھینکیں تو وقتی طور پر ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور پانی کی سطح پر لہریں کچھ دیر تک حرکت بھی کرتی رہتی ہیں لیکن جلد ہی نارمل پوزیشن واپس آجاتی ہے۔ دین کے حوالے سے اس امت کی نارمل پوزیشن وہی ہے جس پر یہ امت چودہ سو سال سے چلی آرہی ہے، اس میں روشن خیالی کا کوئی پتھر کر وقتی ارتعاش تو پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن کیا اس طرح کی حرکتوں سے امت کو اس کی نارمل دینی پوزیشن سے محروم کیا جاسکتا ہے؟ اب تک کی تاریخ کا جواب اس کی نفی میں ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۳؍دسمبر ۲۰۰۶ء)

حدود قوانین اور ہمارا قانونی وعدالتی نظام

تحفظ حقوق نسواں بل: سسٹم کو درست کیا جائے

حدود آرڈیننس اور تحفظ حقوق نسواں بل کی بحث پھر سے قومی حلقوں میں شدت اختیار کرنے والی ہے، اس لیے کہ ۱۰رنومبر کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا گیا ہے، جس کے بارے میں وفاقی وزیر قانون کا کہنا ہے کہ اس میں تحفظ حقوق نسواں بل کو سلیکٹ کمیٹی کی تجویز کردہ صورت میں منظور کر لیا جائے گا، جبکہ متحدہ مجلس عمل نے اس دھمکی کا پھر سے اعادہ کیا ہے کہ ''خصوصی علما کمیٹی'' کی سفارشات کے بغیر اس بل کو منظور کیا گیا تو اس کے ارکان اسمبلیوں سے مستعفی ہو جائیں گے، مگر اس بحث اور تقابل سے قطع نظر راقم الحروف نے گزشتہ دنوں بعض ایسے حضرات سے رابطہ قائم کیا جو عدالتی سسٹم سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں خاصے تجربے کے حامل ہیں۔ میری شروع سے رائے ہے کہ حدود آرڈیننس کے غلط استعمال یا جرائم کے کنٹرول میں اس کے موثر نہ ہونے کے حوالے سے جو شکایات عام طور پر پائی جاتی ہیں، ان کا تعلق قوانین سے نہیں، بلکہ ہمارے معاشرتی رویے اور عدالتی سسٹم سے ہے، اس لیے ان حضرات سے رائے لینی چاہیے جو عدالتی سسٹم کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں گزشتہ ربع صدی سے قضا اور افتا کا نظام سرکاری طور پر موجود ہے اور جج صاحبان کے ساتھ قاضی صاحبان اور مفتی صاحبان بھی تحصیل اور ضلع کی سطح پر عدالتی فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے ساتھ ضلع قاضی بھی شریک کار ہوتے ہیں اور اسلامی قوانین کے حوالے سے دونوں مشترکہ طور پر فیصلے کرتے ہیں، چنانچہ اس ضمن میں

ان کا تجربہ اور معلومات زیادہ مستند اور وسیع ہیں۔ اس پس منظر میں راقم الحروف نے آزاد کشمیر کے بعض سیشن جج، ضلع قاضی اور ضلع مفتی صاحبان سے اس بارے میں رائے طلب کی ہے۔ ان میں سے تین بزرگوں نے اپنی رائے اور تجاویز سے نوازا ہے۔ مولانا قاضی بشیر احمد آزاد کشمیر کے بزرگ علما میں سے ہیں۔ کم وبیش ربع صدی تک ضلع قاضی کے طور پر فرائض سرانجام دینے کے بعد گزشتہ سال ریٹائر ہوئے ہیں اور اب ضلع باغ میں ہاڑی گہل کے مقام پر ایک دینی درسگاہ چلا رہے ہیں۔ مولانا مفتی رویس خان ایوبی بھی آزاد کشمیر کے بڑے علما میں سے ہیں۔ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ سے تعلیم یافتہ ہیں، طویل عرصہ سے میر پور کے ضلع مفتی ہیں جبکہ سردار ریاض احمد نعمانی باغ کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مستند عالم دین بھی ہیں۔

مولانا قاضی بشیر احمد نے لکھا ہے کہ:

> ''نیشنل کمیشن فار دی اسٹیٹس آف ویمن'' نے حدود آرڈیننس کو عورتوں کے مفاد کے خلاف قرار دے کر ان میں ترامیم کا مطالبہ کیا ہے۔ اس مسئلے پر آج کل پورے ملک میں گرما گرم بحث ہو رہی ہے، چنانچہ اس وقت قومی اسمبلی میں تحفظ حقوق نسواں بل پیش ہے اور معاملے کو سلجھانے کے لیے حکومت نے اپوزیشن کے مشورے کے بعد خصوصی علما کا ایک کمیشن قائم کیا ہے۔ اس کمیشن نے کافی غور وخوض کے بعد اپنا موقف پیش کیا ہے۔ ہمیں خصوصی علما کے اس موقف سے مکمل اتفاق ہے۔ حدود میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ قومی خواتین کمیشن کا یہ اعتراض کہ حدود قوانین کی مختلف دفعات کو خواتین کے خلاف امتیازی طور پر استعمال کیا اور ان کو عرصہ دراز تک بے بنیاد مقدمات میں الجھا کر جیلوں میں رکھا جاتا ہے، درست نہیں ہے چنانچہ اس سلسلے میں ویمن ایڈ ٹرسٹ کی تحقیق خود اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔

درحقیقت یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں۔ ایک قانون اصل یعنی Substantive law، دوسری چیز طریقہ کار یعنی Procedure۔ جہاں تک امر اول کا تعلق ہے، اس میں کوئی ردوبدل ممکن نہیں ہے اور اس کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ کوئی زیادتی بھی نہیں پائی

جاتی۔ جہاں تک دوسری چیز، یعنی طریقہ کار کا تعلق ہے، یہ قابل غور ہو سکتا ہے:

۱۔تعزیرات پاکستان کے تحت چالان پندرہ دن کے اندر اندر عدالت مجاز میں پیش ہونا چاہیے، جیسا کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۷۳ کا منشا ہے، لیکن اس میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ اس کا ازالہ کرنے کے لیے چالان کو بروقت عدالت مجاز میں پیش کرنے کو یقینی بنایا جائے۔

۲۔مقدمے کی سماعت کی رفتار موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ گواہان وغیرہ کی حاضری کو مقررہ تاریخ پر یقینی بنایا جائے۔ اس ضمن میں فریقین مقدمہ اوران کے وکلا کی عدالت مجاز میں موجودگی کے علاوہ خود عدالت مجاز کے پریزائیڈنگ آفیسر کی حاضری کو بھی یقینی بنایا جائے۔

۳۔چالان کی فہرست میں غیر ضروری گواہان اور ملزمان کو درج نہ کیا جائے، ورنہ مقدمے کی کارروائی غیر ضروری طور پر طویل ہو جائے گی۔

۴۔حدود قوانین کا ایک مخصوص مزاج ہے، اس کو سمجھنے کے لیے پولیس کو خصوصی تربیت دی جائے، تاکہ پولیس عدالت مجاز میں غلط چالان پیش نہ کرے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی رپورٹ (FIR) کی بنیاد پولیس چالان پیش کر دیتی ہے اور مقدمے کی کافی عرصے تک سماعت کے بعد عدالت اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ پولیس نے یہ چالان غلط پیش کیا ہے۔ لہٰذا وہ کسی دوسری عدالت مجاز میں از سر نو کارروائی کرتی ہے، اس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔

۵۔حدود کا معاملہ دیگر قوانین سے بہت مختلف ہے۔ عدالت مجاز سماعت مکمل کرنے کے بعد اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ حد کا جرم تو ثابت ہو چکا ہے، لیکن اس جرم کی جو سزا تجویز ہے، وہ نافذ نہیں کر سکتی، اس لیے کہ اس سزا کو نافذ کرنے کی شرائط پوری نہیں تو ایسی صورت میں اگر عدالت اپنے زیر سماعت دفعہ سے ملزم کو بری کر دے یا یہ قرار دے کہ اس کو اس عدالت میں پیش کیا جائے جو تعزیرات پاکستان کے تحت سماعت کی مجاز ہو تو اس

طرز عمل سے بہت ساری پیچیدگیاں پیدا ہوں گی، لہٰذا اس طرح کی پریشانیوں کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ قانون کے اندر یہ قرار دیا جائے کہ حدود کے مقدمات کو سماعت کرنے والی عدالت اپنے زیر سماعت مقدمات میں اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ جرم تو ثابت ہو چکا ہے، لیکن کسی فنی وجہ سے اس کو حد کی سزا نہیں دی جا سکتی تو اس عدالت کو اختیار ہے کہ وہ اسی مواد کی بنیاد پر جو اس کے سامنے پیش ہوا ہے، متبادل سزا تجویز کرے۔ اس صورت میں مقدمہ یکسو ہو جائے گا اور طوالت سے بچ جائے گا۔

۶۔ خواتین کی شکایات کا ازالہ حدود کے قوانین میں ترمیم یا تنسیخ سے نہیں ہوگا، بلکہ سماعت کے طریقہ کار اور پولیس کی تفتیش کے طریق کار میں اصلاح کرنے سے ہوگا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کی دفعہ ۲۰ کے تحت تعزیرات پاکستان ۱۹۸۸ء کا اس آرڈی ننس پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ حدود کے مقدمات کے اندارج اور تفتیش میں پولیس کو اختیارات کے غلط استعمال کا موقع مل جاتا ہے اور لوگوں کو ظلم، جبر اور ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی کو جواز بنا کر وہ حدود کے قوانین پر اعتراض کرنے لگتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ پولیس کی تفتیش اور مقدمات کے اندارج کا ایک نیا اور مخصوص طریق کار وضع کیا جائے جو حدود کے مزاج کی عکاسی کرتا ہو۔

۷۔ تعزیرات پاکستان ۱۹۸۸ء میں اصلاح کرنے سے خواتین کی شکایات کا ازالہ ممکن ہے۔ اس ضمن میں ضروری ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار میں تعزیرات پاکستان کو بھی شامل کیا جائے، تاکہ وہ خامیوں کا ازالہ اور نشاندہی کر کے ظلم اور زیادتیوں کا ازالہ کر سکے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تعزیرات پاکستان کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا ہے۔''

یہ تحریر مولانا قاضی بشیر احمد کی ہے، جس پر باغ کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج سردار ریاض احمد نعمانی صاحب نے لکھا ہے کہ: ''جناب قاضی صاحب کے فاضلانہ موقف سے راقم الحروف کو سو فی فیصد اتفاق ہے۔ اگر طریق سماعت کی پیچیدگیوں کو احسن طریق پر لایا جائے، پولیس کی تربیت بھی

ہو اور ان کی نزاکت سے ان کو واقف کیا جائے تو درستی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔'' جبکہ میر پور کے ضلع مفتی مولانا قاضی رویس خان ایوبی لکھتے ہیں کہ

''آپ کی تجویز کردہ تمام ترامیم اگر منظور بھی کر لی جائیں تو بھی کسی قانون کا عملی نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہمارا عدالتی نظام درست سمت میں حرکت نہ کرے۔ پولیس کا فرنگیانہ سسٹم جب تک چلتا رہے گا، کسی بھی قانون کا قانون بن جانا مفید نہیں۔ پولیس وہ بنیادی پتھر ہے جہاں سے تنفیذ کی دیوار کی نیو کھڑی ہوتی ہے ۔ایف آئی آر کیا ہے؟ ضمنیاں کیا ہوتی ہیں؟ ''حد'' کسے کہتے ہیں؟ شبہ کیا شے ہے؟ اس کی کتنی اقسام ہیں؟ حبس اور تعذیب میں کیا فرق ہے؟ نصاب شہادت پورا نہ ہو تو تعزیری سزاؤں کی کیا صورت ہوگی ؟ اگر مقدمہ حدود آرڈیننس کے تحت درج ہوا ہے اور حد ثابت نہیں ہو سکی تو تمام تر قرائن کے باوجود مجرم صرف اس لیے بچ نکلتا ہے کہ جس دفعہ کے تحت عدالت میں چالان پیش ہوا ہے، استغاثہ اسے ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ جب تک تھانوں میں فقہ اور حدیث پر معلومات رکھنے والے لوگ نہیں ہوں گے، حدود آرڈیننس بازیچہ اطفال بنا رہے گا۔ قصور حدود آرڈیننس کی دفعہ بندی یا قانون کی توضیح کا نہیں۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ کلاشنکوف نابالغوں کے ہاتھ میں تھما دی گئی ہے اور ان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ تم چوروں کا پیچھا کرو۔ شریعت کورٹ یا ایپلٹ بینچ وفاقی سطح پر قائم ہیں اور مقدمے کی ابتدا وسطانی سطح (سیشن جج) سے شروع ہوتی ہے یا تعزیری جرائم میں تحتانی (سب جج) سے، جبکہ تحصیل، فوجداری عدالت اسلامی فقہ جاننے والوں سے خالی ہے، سیشن کورٹ خالی ہے تو مقدمات یکسو کیسے کیے جا سکتے ہیں؟''

حدود آرڈیننس کے موثر نہ ہونے یا ان کے غلط استعمال کے بارے میں یہ تاثرات ان حضرات کے ہیں جو عدالتی سسٹم کا حصہ ہیں، مقدمات سنتے اور فیصلے کرتے آ رہے ہیں اور ان سے میری اس گزارش کی تائید ہوتی ہے کہ حدود آرڈیننس کے بارے میں جو شکایات کسی درجے میں جائز بھی ہیں، ان کی ذمہ داری قوانین پر نہیں، بلکہ سسٹم اور پروسیجر پر عائد ہوتی ہے، لیکن ہم

اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے حدود آرڈیننس کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں، جس سے اس تاثر کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے نام سے حدود آرڈیننس میں تجویز کی جانے والی ترامیم کا اصل مقصد ان قوانین کی اصلاح اور انہیں قابل عمل بنانا نہیں، بلکہ ان کو ختم کرنا یا مزید غیر موثر بنا دینا ہے اور اس کی وجہ مغرب کا وہ دباؤ ہے جو پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے اور چند نافذ شدہ اسلامی قوانین کو ناکام بنانے کے لیے مسلسل جاری ہے۔

میں اپنے اس موقف کی تائید میں ایک اور شہادت کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس معاملے کے سب سے اہم فریق پولیس کا ہے۔ اسے پنجاب پولیس کے سابق آئی جی حاجی حبیب الرحمٰن صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ روزنامہ ''نیشن'' لندن میں ۹/اگست ۱۹۹۸ء کو شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں پنجاب پولیس کے سابق سربراہ فرماتے ہیں کہ:

''کچھ عرصہ ہوا میں باہر گیا۔ وی آنا میں یونائیٹڈ نیشنز کا فورم تھا۔ یو این او والوں نے مجھے انوی ٹیشن کارڈ براہ راست بھیجا تھا۔ میں ایشین ممالک کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس طرح یورپ کے علاوہ ایشیا کے نمائندے بھی تھے۔ وہاں ہم نے کرائم پریونیشن (Crime prevention) پر ایجنڈا تیار کرنا تھا۔ میں نے پیپر پڑھا: ''انٹروڈکشن آف اسلامک لا ان پاکستان''۔ میں ضیاء الحق کے سزا کے نظریے کے خلاف بولا۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ ''تھیوری آف پنشمنٹ'' کیا ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ آگ آپ کے سامنے ہے، اس میں بچہ یا کوئی پاگل یا کوئی بندہ انگلی مارے تو آگ سے اس کی انگلی جل جاتی ہے تو وہ دوبارہ آگ کے قریب نہیں جائے گا، چاہے بچہ ہو چاہے پاگل ہو یا کوئی اور ہو۔ اگر آپ نے آگ میں انگلی دی اور آپ کی انگلی نہیں جلی تو پھر آپ آگ میں انگلی داخل کرتے رہیں گے۔ میں نے کہا کہ بیس سال ہو گئے، کسی چور کا ہاتھ نہیں کٹا۔ میں نے کہا، یہ اقدام قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ اسلام کہتا ہے: اسلام میں داخل ہو جاؤ 'کافۃ' پورے کے پورے۔ آپ بائی پارٹ نہیں آسکتے۔ آپ مسلمان ہوں گے تو پورے ہوں گے۔ یا تو آپ مسلمان ہیں یا نہیں ہیں۔ جاہل آدمی بھی یہ قدم نہیں اٹھائے گا کہ

سسٹم تو وہی ہے لیکن سزائیں آپ قرآن کی انٹروڈیوس کریں۔ میں نے کہا: سسٹم جو ہے، وہ سرمایہ دارانہ ہے۔ آپ کا اقتصادی نظام غیر قرآنی، آپ کا سیاسی نظام، آپ کا عدالتی نظام غیر قرآنی۔ آپ کا سوشل اکنامک نظام غیر قرآنی ہے۔ پولیٹیکل سسٹم غیر قرآنی تو آپ سزائیں قرآنی کیسے دے سکتے ہیں؟‘‘

ان گزارشات اور حوالہ جات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بے چارے حدود آرڈیننس کو ’’چاند ماری‘‘ کی مشق کا ہدف بنائے رکھنے کی بجائے صورت حال کا اس پہلو سے بھی جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ یہ صرف حدود آرڈیننس کا مسئلہ نہیں، بلکہ دوسرے قوانین کے حوالے سے بھی یہی شکایت ہے کہ موجودہ عدالتی سسٹم اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا عمومی معاشرتی رویہ قوانین کے موثر نفاذ اور اس کے نتیجہ خیز ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، مگر ہم اس رکاوٹ کو دور کرنے اور اس کا پیچھا چھڑانے کی بجائے کولہو کے بیل کی طرح قوانین میں ترامیم اور ترامیم در ترامیم کے بے مقصد عمل کے گرد چکر کاٹتے جا رہے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۴ر نومبر ۲۰۰۶ء)

حدود آرڈیننس: تاثرات وخیالات

حدود آرڈی ننس کے بارے میں آزاد کشمیر کی عدلیہ اور رفقا سے تعلق رکھنے والے تین حضرات کے تاثرات اور تحفظ حقوق نسواں بل کے حوالے سے ان کے خیالات گزشتہ کالم میں پیش کر چکا ہوں۔ اب پنجاب کے ایک ضلع میں عدالتی خدمات سرانجام دینے والے حاضر سروس ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے تاثرات انہی کے قلم سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان سیشن جج صاحب کا نام اور ضلع مصلحتاً درج نہیں کر رہا۔ ان کی تحریر کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ حدود آرڈیننس اور عورتوں کے حقوق ومسائل کے بارے میں موجودہ کشمکش اور بحث ومباحثے کو عدلیہ کے ذمہ دار لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ تحریر مجھے گزشتہ دنوں دوبئی آتے ہوئے موصول ہوئی ہے اور میں نے اس کا مطالعہ دوبئی میں کیا ہے۔ میں ۶ نومبر کی شام کو دوبئی پہنچا ہوں اور ۱۳ر نومبر کو واپسی کا ارادہ ہے۔ اس دوران میں قارئین کو اپنے مشاہدات اور تاثرات سے آگاہ کرتا رہوں گا۔ ان شاء اللہ۔

’’جرم کی تعریف اور اس کی نوعیت مختلف ادیان میں مختلف انداز میں بیان کی گئی ہے، جبکہ ہر معاشرے نے اپنی اقدار کے اعتبار سے اس کی تعریف میں ہمیشہ ترمیم وتبدیلی کی ہے اور سزاؤں کے اطلاق میں مختلف آرا موجود ہیں۔

جو آفاقی ادیان آج روئے زمین پر باقی ہیں، ان کے پیروکاروں میں سزاؤں کا اطلاق اپنی مرضی سے ہے اور وہ اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں، جبکہ مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ

حد اور تعزیر دو اقسام کی سزائیں ہیں اور حد جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ ہے، اس میں کوئی تبدیلی و تغیر ممکن نہیں ہے، کیونکہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اور ہماری اخلاقیات اور قوانین تمام کی تمام مذہب کے تابع ہیں۔ مگر کچھ عرصے سے ایک طبقہ اس بات پر مصر ہے کہ قانون ایسا ہو جو کہ لوگوں کی مرضی اور طبائع کے مطابق ہو، بلکہ ایک طبقے کی خواہشات کا آئینہ دار ہو اور اس میں حتیٰ کہ ''حدود'' کے ضمن میں تبدیلی کا اختیار کسی ادارہ، پارلیمنٹ یا طبقے کو حاصل ہو، خصوصی طور پر ''حد'' کی خاص شکل جو ''نسواں'' کے جرائم سے متعلقہ ہے، اس کو ایک خاص طریقے سے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور ''اسلامی حدود'' اور سزاؤں کو متنازعہ بنا کر پیش کرنے میں اس کا خاص عمل دخل ہے۔ مذہب نے حفظ ماتقدم کے طور پر ان تمام عوامل کو بھی جرائم کی فہرست میں شامل کیا ہے جو کہ بڑے جرم، جن پر ''حد'' نافذ ہوتی ہے، کے ہونے کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اس لیے معاشرت اور معاشرتی نظام کو مذہب نے بڑی اہمیت دی ہے اور اسے بے لگام نہیں چھوڑا، بلکہ عبادات سے زیادہ احکامات معاشرت اور معاشرتی نظام پر ہیں، جن میں لین دین، رشتہ داری، تعلقات، سماجی مسائل شادی، طلاق کے مسائل اور دیگر امور شامل ہیں۔ زنا کا خصوصی حوالہ ہمارے خطے کے اعتبار سے، خطے کی ثقافت کے اعتبار سے اور ہماری مذہبی اقدار و روایات کے حوالے سے بہت اہم ہے۔

زنا کی عمومی صورتیں یہ ہیں: زنا کا ہونا، زنا کرنا، زنا بالجبر، زنا بالرضا۔

ہمارے ملکی قانون میں زنا بالجبر اور بالرضا کی الگ الگ تعریف موجود ہے اور اس کی سزائیں بھی الگ الگ وضاحت کے تحت ہوتی ہیں اور اس پر کافی قانونی شکل موجود ہے، مگر دونوں کا اطلاق ''حدود'' کے زمرے میں آتا ہے مگر مختلف قانونی دفعات کی شکل میں ہے، جبکہ شریعت میں زنا ایک ہی لفظ اور ایک ہی مفہوم کے ساتھ آیا ہے۔ اس کی سزا کا بھی ''حد'' میں تعین کیا گیا ہے۔ یہ بحث بہت ہو چکی کہ ''حد'' کب لگتی ہے اور اس کے کیا اجزا اور عوامل ہیں، مگر یہ طے ہے کہ ''حد'' جب لگے گی جب کوئی واقعہ قانون کی

گرفت میں لایا جائے گا۔ یہ مروجہ اصول ہے کہ جب کسی شے کی اہمیت ختم کرنا مقصود ہو تو اسے متنازعہ بنا کر اس پر بحث شروع کر دی جائے۔

اب تک جو بحث عوام وخواص، حتیٰ کہ علمائے کرام میں جاری رہی یہی ہے کہ ''حد'' کیا ہے؟ کیا ''زنا بالجبر'' اور ''زنا بالرضا'' دونوں ''حد'' کی زد میں آتے ہیں اور دونوں پر حد جاری ہوسکتی ہے یا نہیں، بالخصوص ''زنا بالجبر''۔

یہ نکتہ قانونی طور پر بہت اہم ہے کہ اس کی ذمہ داری پولیس پر ہے کہ دیکھے کہ زنا بالجبر ہے یا زنا بالرضا، تاکہ اس کے مطابق کارروائی ہو۔ اس کا نتیجہ موجودہ قانون کی روشنی میں ہوگا اور ہو رہا ہے کہ زنا بالجبر ہی کے تمام معاملات لائے جائیں گے اور زنا بالرضا کا تصور ہی ختم ہو جائے گا۔ عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ عورت جس فریق کے قبضے میں چلی جاتی ہے، اس کے حق میں ہی بیان دیتی ہے، واقعات اور حقائق چاہے کچھ بھی ہوں۔ اس مرض کا کیا علاج ہے؟ قانون صرف ان الفاظ پر حرکت میں آئے گا جو شہادتیں، بیانات اور حقائق پولیس اکٹھی کرے گی اور ضلع کا ایس پی درجے کا افسر اس پر قانون کا اطلاق کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرے کو برائی کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مرد عورت کے آزادانہ اختلاط کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا کہ جب تک چار افراد زنا بالرضا کے گواہ نہ ہوں گے تو نہ پرچہ درج ہوگا نہ ہی اس پر کوئی دوسرا جرم لگے گا۔ مقامی پولیس کو تو اس پر گرفت اور چیک کا اختیار ہی نہیں۔ مقدمہ درج ہوتے ہوتے کتنے تکلیف دہ مراحل متاثرین برداشت کریں گے، اس کا تصور ہی نہیں کیا گیا۔

مقدمہ درج کرانے کا اس قدر مشکل طریقہ بنا دیا گیا کہ ہر آدمی کی استطاعت سے باہر ہے۔ یہ تو صرف وسائل اور قوت والے لوگوں کے لیے رعایت ہے کہ ان کے پاس افراد اور مال دونوں موجود ہیں اور وہ اپنی مرضی سے اس کا اطلاق کرا سکیں گے۔ جب وقوعہ کی رپٹ بھی درج نہیں ہوتی تو غریب آدمی کہاں ایس پی درجے کے افسر کے پاس ۴ افراد کو لے جا کر اپنی بات سنائے گا۔ توہین رسالت کی دفعات کو جب قانون میں

شامل کیا گیا تو اس کے اطلاق کے لیے بھی ایسے ہی عوامل درپیش تھے، تاہم اس ضمن میں کئی مقدمات درج ہوئے، مگر زنا بالرضا کا معاملہ بہت حساس اور پورے معاشرے کی معاشرتی اقدار کو بے دردی سے تبدیل کرنے کی منفی خواہش ہے۔ نوجوان نسل کو تباہ کرنے کی سازش ہے، بلکہ مذہب سے دور کرنے کی اصل سازش ہے اور یہ قانون اس کی بنیاد ہے۔ عورت کے ذہن سے معاشرے کی طرف سے قدغن کا خوف ختم ہو گیا تو سارا معاملہ اور ماحول بگڑ جائے گا۔ قانون بنانا اتنا مسئلہ نہیں ہے جتنا اس پر عمل کروانا یا اس کا اجرا کرنا مسئلہ ہوتا ہے۔

اب تک جو بحث علمائے کرام کے مابین رہی، وہ بھی یہی تھی کہ قانون شرعی ہے یا غیر اسلامی۔ بات سزاؤں پر تھی۔ اس کے اطلاق پر تھی۔ اصل نکتہ نہ تو علما کو بحث کے لیے پیش کیا گیا، نہ ہی ان سے اس کے متعلق رائے مانگی گئی۔ غلط واقعات پر جیسے لوگ مرضی کا فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں، گورنمنٹ نے بھی یہی کیا اور اب تشہیر شروع کر دی کہ علما کمیٹی نے اس کو شرعی قرار دیا ہے۔ علمائے کرام کے سامنے سوال جرم کے شرعی ہونے اور اس کے شرعی اطلاق اور سزا سے متعلق تھا۔ نہ تو انہیں بتایا گیا کہ اس کا اطلاق قانونی طور پر کیسے ہوگا، مقدمہ درج کرانے کی شرائط، مقدمہ کے بارے میں قانونی نکات کہ ضابطے کو کون کون لوگ ہینڈل کریں گے، اس بارے میں کوئی بات نہ بتائی گئی، نہ پوچھی گئی۔ اب قانون کی زبان میں اصلاحات اور ان کی تعریف میں کوئی کمی یا زیادتی نکالے گا۔ انہوں نے سوال کے مطابق صحیح جواب دے دیا، مگر حکمرانوں کی نیت چونکہ شروع سے خراب تھی، اس لیے اللہ نے عوام میں ایسا طبقہ سامنے رکھا جس نے مسلسل اس کی مخالفت کی۔ قانون کو اتنا مشکل بنا کر پیش کیا جائے کہ لوگ خود اس سے احتراز کریں۔

ایک ہے لفظوں کے معنی، اور ایک ہے ان کی حقیقت۔ اسی اعتبار سے قانون میں حد سے زیادہ گنجایش رکھ دی گئی کہ جرم جرم ہی نہ رہے اور لوگ اس کو جرم جاننا اور سمجھنا بند کر دیں۔ اسی سازش کے تحت اس کے اطلاق کے قانون کو بنایا گیا۔ دفعہ ۱۵۶۔ بی

ضابطہ فوجداری میں یہ بات طے کی گئی کہ جس حدود کیس میں عورت ملزم کی حیثیت سے ہو تو اس کو ایس پی (Investigation) سے کم کا افسر تفتیش نہ کرے اور ملزمان کو بھی عدالت کی اجازت کے بغیر گرفتار نہ کیا جائے۔ان دوشقوں کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ کیا پولیس کی (powers) کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے یا ان کی قوت واختیارات پر check لگایا گیا ہے یا پھر اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ پولیس ایسی کسی معاشرتی برائی کو کسی بھی اطلاع پر نہ چیک کر سکتی ہے، نہ ہی اس میں مداخلت کا اختیار رکھتی ہے؟ کیا یہ شق کسی اور جرم کے لیے بھی لگائی گئی ہے؟ عورتوں کو صرف حدود کے کیس میں ہی یہ رعایت کیوں؟ ملزم خواہ مرد ہو یا عورت، کہاں لکھا ہے کہ اس میں تفریق کی جائے؟ یہ شق جو کہ قانون کے اطلاق کے سلسلے میں ہے، خود بتاتی ہے کہ بنانے والوں کی نیت کیا ہے۔

۱۔عورتوں سے یہ خوف ختم کر دیا جائے کہ اگر وہ کوئی ایسا جرم کریں گی تو کوئی مزاحمت کرے گا، نہ روکے گا۔

۲۔معاشرے میں بے راہ روی کو عام کرنے کا ایک طریقہ، بلکہ ترغیب ہے۔

اگر معاشرے میں چیک کا سسٹم ختم کر دیا جائے تو سارا معاشرہ جنگل ہو جائے گا۔ پھر اسلامی معاشرے میں ایسی شقوں کا اطلاق تو لوگوں کو مذہب سے بیگانہ کرنے کی سازش ہے، حالانکہ طے شدہ بات ہے کہ عمومی اختلاط مرد وزن کئی جرائم کو جنم دیتا ہے۔ آپ اس کی اجازت دیتے ہیں بلکہ اس کی ترغیب دیتے ہیں، بلکہ قانون بناتے ہیں کہ جو اس سے روکے گا وہ قانونی طور پر مجرم ہوگا۔ پھر کم از کم حدود کے اطلاق کو تو اتنا مشکل نہ بنائیں کہ سارے معاملات منفی ہو جائیں۔ تفتیش ایک بات کی تہہ تک پہنچنے کا ذریعہ اور طریقہ ہے ،اس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے، مگر جب اندراج وقوعہ ہی اتنا مشکل ہوگا، جب اس کے اطلاق میں ہی اتنی رکاوٹیں ہوں گی تو پھر کون جرات کرے گا اس کو اٹھانے کی اور کس کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ ان کے لیے جدوجہد کرے؟

۲۹۵۔سی کی تفتیش ایس پی کو دینے کے کئی مقاصد تھے۔ مثلاً یہ کہ ہر کوئی ہر کسی پر جھوٹا

الزام نہ لگا دے اور پھر اس میں الفاظ کے استعمال ان کی تعبیر وتشریح اوران کے اطلاق اہمیت رکھتے تھے، مگر زنا تو ایک عمل ہے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے اوراس کے بارے میں رائے دے سکتا ہے اور معاشرے کے طبقات اس کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ۲۹۵۔سی میں ایسا نہیں ہے، معاشرے میں اس کے لیے ملزم کو بطور عبرت ہی گردانا جاتا ہے، جبکہ حدود کی ان شقوں کے اطلاق سے ملزم کی حیثیت VIP اور ہیرو کی سی ہوگئی ہے۔

۲۹۵۔سی میں تفتیش ایس پی کے حوالے کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی کو اس میں غلط طور پر نہ پھنسا دیا جائے، جبکہ حدود کیس ایس پی کے حوالے کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مقدمہ ہی درج نہ ہو۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ ۲۹۵۔سی کے تحت آج تک جب سے قانون بنا ہے، کتنے مقدمات درج ہوئے ہیں؟ حدود کے شاید روز اس سے زیادہ مقدمات بنتے ہیں اور واقعات ہوتے ہیں۔ اب انتظامی طور پر بھی دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ایس پی رینک کے کتنے پولیس افسران ضلع میں ہوتے ہیں۔ پوچھ گچھ کیسے ہوگی تفتیش کیسے کرے گا، اگر اس نے موقع ملاحظہ کرنا ہوگا تو کیسے ہوگا، شہادتیں کیسی اکٹھی کرے گا؟ پھر تو یہ ہوگا کہ ایس پی دفتر میں بیٹھا رہے گا اور سارا دن لوگ خود ہی جھوٹی سچی گواہیاں لا کر اس کے سامنے پیش کر دیں گے جن کو فوری طور پر جانچنے کا اس کے پاس کوئی پیمانہ نہ ہوگا۔ یوں غلط مقدمات کی بھرمار ہو جائے گی۔ طاقت ور وسائل والے لوگ مرضی سے مقدمات درج کرواتے رہیں گے۔ کئی اضلاع میں ہیڈ کوارٹر سے فاصلے ۴۔۵ گھنٹے سے زائد کے ہیں۔ کچے کے علاقے میں یہ فاصلے اور بھی زیادہ ہیں۔ کون اتنے گواہان کو لے کر روز ایس پی کے پاس جائے گا اور اپنی تفتیش کروائے گا اور پھر مقدمہ درج ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اب مقامی پولیس بھی یہی کہتی ہے کہ زنا بالجبر کا پرچہ کروالو۔

۹/۷/۱۱، ۹/۷/۱۶، ۹/۷/(۲)۱۰ کی دفعات کے تحت پولیس والے پرچہ درج کرنے سے کتراتے ہیں کہ اتنا مشکل عمل ہے، کیسے پورا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں بے باک ہوگئیں۔ گناہ اور جرم دونوں میں مرد وزن کے لیے کوئی تفریق نہیں ہے۔ مگر

اس قانون کے اطلاق سے عورتوں کا تحفظ نہیں، ان کی رسوائی کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے۔ انہیں جرم کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور ترغیب دی جا رہی ہے۔ یہ بحث کہ جرم بنتا ہے، صرف اسی لیے کی جاتی ہے کہ جرم کو بڑھانے کا جواز پیدا کیا جائے، جرم کو protection دی جائے۔ میری نظر میں جرم کے شرعی یا غیر شرعی ہونے سے زیادہ یہ اہم ہے کہ کس نیت سے اور کیا نتیجہ آپ اس بحث سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر حدود کو بھی اپنی مرضی سے اطلاق کرنا ہے اور اس میں بھی مداخلت کرنی ہے تو یہ کھلی بغاوت ہے اور ہم سب اس کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

گناہ کو گناہ سمجھ کر اس کو جرم قرار دینا چاہیے اور اس کا اطلاق بھی ویسے ہی ہونا چاہیے، جیسے شریعت نے کہا ہے۔ اس میں کسی سے کوئی رعایت صنف کی وجہ سے نہ ہو، اس کی حیثیت کی وجہ سے نہ ہو۔ اگر ہم نیت کر لیں کہ جرم کو جرم سمجھنا ہے اور اس کی سزاؤں کا اطلاق شرعی طریقے سے کرنا ہے تو یہ معاملات رک سکتے ہیں، ورنہ خالی بحث سے نئی نسل مذہب سے مزید دور ہو جائے گی اور ان کے خیالات کنفیوز ہو جائیں گے۔ قانون نافذ کرنے والا ادارہ، اس کی تفتیش کرنے والا ادارہ اگر صحیح مسلمان ہو جائیں تو ۹۰ فیصد جرائم کا خاتمہ ویسے ہی ممکن ہے۔

دوسرا معذرت کے ساتھ، ہر شخص کو اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ مذہب کے احکامات کی خود سے تعبیر و تشریح کرے، مرضی کے معنی پہنائے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس کے حصول میں اپنا وقت اور زندگیاں لگائی ہیں۔ عام طبقات سے حدود میں بحث کروا کر مذہب کی اصل کو ضائع نہ کرنا چاہیے۔ خصوصی طور پر ان طبقات سے جو مذہب کی بنیاد سے ہی ناواقف ہیں۔ چند کتابیں پڑھنے سے آدمی عالم نہیں ہوتا، اصل اس کا کردار ہوتا ہے، اس لیے اس بحث کو عوام الناس میں لے کر نہ جائیں۔ اگر آپ کی نیت کسی اور طرح کا معاشرہ پیدا کرنا اور بنانا ہے تو اخلاقی جرات کا مظاہرہ کریں اور اس کا اعلان اور اطلاق کریں۔ مذہب کی تعلیمات کو متنازعہ نہ بنائیں، اس سے بے راہ روی

پھیلے گی۔

علماے کرام سے میری گزارش یہی ہے کہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' میں آپ کی سفارشات قابل قدر ہیں مگر آپ حدود پر اپنی رائے میں احتیاط برتیں، خصوصی طور پر اطلاق، تفتیش، اندراج مقدمہ کے بارے میں جب تک تمام کام طے نہیں ہو جاتا، اس پر شرعی یا غیر شرعی کا کوئی فتویٰ نہ دیں، ورنہ قیامت کے دن ہم سب جواب دہ ہوں گے۔

کسی کی نیت کو جاننا بہت مشکل ہے، مگر اس کے اعمال اور اقدام کچھ نہ کچھ قرائن بتاتے ہیں۔ حکمرانوں کے اقدامات اور لہجہ اور گفتگو نشاندہی کرتا ہے کہ وہ مذہب کو متنازعہ بنانے پر کوشاں ہیں۔ ہمیں اس کا حصہ نہیں بننا چاہیے بلکہ ہماری کوشش یہی ہو کہ جو اللہ کے احکامات ہیں، ان کا مکمل طور پر اطلاق ہو۔ اسلام نے جب عمومی اختلاط پر پابندی لگائی ہے تو پھر اس کے بغیر اگلی بات کیسے ممکن ہے؟ اسلام نے گناہ کے اسباب کو پہلے روکا ہے، پھر سزاؤں کا تعین کیا ہے، لہٰذا ہمیں پہلے اس کے اسباب کو روکنا ہوگا، اس کے جواز کو ختم کرنا ہوگا۔ پھر ہم اس کے بارے میں کوئی رائے زنی کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس بل کے منفی مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علماے کرام کو بھی رائے میں اپنی حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں ایک اہم تذکرہ یہ ہے کہ جب سے تحفظ حقوق نسواں بل کا چرچا ہوا، اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ عورتوں کے جرائم بے پناہ بڑھ گئے ہیں۔ لوگوں نے عورتوں کو ان جرائم کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح تذلیل نسواں کے نئے راستے اور باب کھل گئے ہیں۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جہاں وسائل اور قوت مجتمع ہوتے ہیں، وہاں یہ بھی عام ہوا ہے کہ زنا بالرضا کو زنا بالجبر میں convert کر کے دوسرے بے گناہ لوگوں کو اس میں دھکیل دیا جاتا ہے اور یہ عمل بہت زیادہ تیز ہو گیا ہے۔ اس سے پولیس کے عام ریٹ بھی بڑھ گئے ہیں، عورت کو خوفزدہ کر کے اس سے مرضی کے بیانات بے گناہ لوگوں کے خلاف دلوائے جاتے ہیں۔ اگر جرم حد کے زمرے میں ثابت نہ بھی ہو تو

اخلاقی طور پر تعزیر کے زمرے میں تو آہی جاتا ہے۔ اگر یہ خوف بھی ختم کر دیا جائے کہ حد کے بعد کوئی شے نہیں تو یہ بھی بہت بڑی بے راہ روی کا سبب بنے گا۔

یہاں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ''حد'' پر قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اس کے اطلاق پر گفتگو ہونی چاہیے۔ اس کی سزاؤں پر کوئی تعبیر، تشریح اس میں ردوبدل یا تغیر قابل قبول نہیں۔ ساری بحث کا محور یہ ہونا چاہیے کہ مقدمہ کیسے درج ہو، کون اس کی تحقیقات کرے اور تحقیقات کا اصل پیمانہ کیا ہو۔

اس ضمن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ تھانہ کی طرز پر ایک سپیشل سیل تشکیل دیا جائے جو کہ ہر حدود کے مقدمے کی تفتیش کرے۔ صرف ایس پی عہدے کے آفیسر کو تفتیش کا اختیار دینا غلط ہوگا۔ اس میں سیاسی، سماجی، معاشرتی دباؤ ایک شخص موجود حالات میں کیسے برداشت کرے گا؟ پھر ایک ضلع میں اگر روزانہ ۵/۱۰ واقعات ہوں تو کیسے اس کو قانونی تقاضوں کے مطابق عمل کرے گا؟ ضابطہ میں ایک بات مزید اضافہ طلب ہے کہ اگر FIR بغیر تفتیش کے درج نہیں کرنی تو کم از کم واقعہ کی رپٹ ہی درج کی جائے تاکہ واقعہ کی صداقت اور اس کے واقعات میں مشوروں کے بعد تبدیلی نہ ہو سکے اور تفتیش کرنے والے آفیسر کے لیے آسانی ہو اور بعد میں عدالت کے لیے بھی حقائق جاننے میں آسانی ہو۔ ورنہ FIR درج ہوتے ہوتے کئی بے گناہ لوگ اس میں مشوروں کے بعد ملوث کر دیے جائیں گے، چونکہ ہمارے معاشرے میں اب یہ Tendency بہت زیادہ نوٹ کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ بے گناہ لوگوں کو ہمراہ کر کے ملوث کر دیا جاتا ہے اور بے گناہ، اصل ملزم کے ساتھ سال ہا سال مقدمے کی تفتیش اور ٹرائل بھگتتا رہتا ہے۔

اگر پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا کو مادر پدر آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ مسائل یقیناً مزید بڑھیں گے۔ قانون کی پاسداری صرف ایک ہی طریقے سے ممکن ہے کہ لوگوں کو یقین ہو کہ مقننہ جو کچھ قانون بنا رہی ہے، یہ کسی مراعات یافتہ طبقے کے لیے نہیں ہے، ہر آدمی پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔ دوسرا میڈیا پر جرائم کو گلیمر کی صورت میں پیش کر کے اس کی

تشہیر بند کی جائے۔ سادگی اور امن کی تعلیمات دی جائیں۔

قانون ساز ادارہ اس ضمن میں اپنی ذمہ داری پوری کرے۔ حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ تعلیمی نظام ان ضروریات کو پورا کرے جس میں معاشرت کو امن اور سلامتی کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ حدود کے قوانین طے شدہ ہیں، ان کے اطلاق کی شکلیں بھی موجود ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ ایسے جرائم سے اجتناب کریں اور ان کو جرم سمجھیں کہ یہ معاشروں کی تباہی کا سبب ہیں۔ بحث صرف اس بات پر مرکوز ہو کہ یہ جرم کیسے ختم ہو۔

اس کو جنم دینے والے اسباب کو تعزیر کی شکل میں نافذ کیا جائے اور اس پر تعزیر میں سخت سزائیں دی جائیں۔ قانون سازی صرف ان جرائم پر کی جائے جو کہ حد سے قبل اس کے وجود میں آنے کا سبب ہیں۔ ان پر خوب عمل درآمد کروایا جائے۔ اس ضمن میں ایک حقیقت نامہ یہ ہے کہ حکومت نے خواتین کے مسائل کے لیے خواتین سیل تھانہ جات میں بنائے ان کا کیا انجام ہوا؟ ان کی کارکردگی کیسی رہی؟ انہوں نے کتنی سفارشات پر کس قدر عمل کروایا؟ اگر اس رپورٹ کا جائزہ لے لیا جائے تو بات کسی قدر سمجھ میں آجائے گی۔

جب تک ہم بنیادی حقوق کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہیں دیکھیں گے اور اس پر عمل درآمد نہیں کروائیں گے، ''حدود'' پر بحث اور اس کی قانون سازی کی باتیں سب فضول اور وقت کا ضیاع ہے، بلکہ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہم مغرب کو خوش کرنے کے لیے اپنی معاشرتی زندگی میں خود زہر گھول رہے ہیں۔ اس بحث سے بے راہ روی آئے گی، مزید انارکی پھیلے گی۔ لوگ مذہب کی تعلیمات کے بارے میں کنفیوز ہو جائیں گے۔ میری گزارش ہے کہ ''حدود'' پر قانون سازی کی بحث کو ختم کیا جائے۔ اس پر قطعاً قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر بحث ومباحثہ بند کیا جائے۔ اس میں نہ تو کسی قانون ساز ادارے کو کمی بیشی کا اختیار ہے نہ ہی اس پر رائے زنی کی اجازت۔ صرف اور

صرف قانون کے اطلاق پر ذمہ داری اور نیک نیتی کے ساتھ عمل درآمد کروایا جائے۔غلط مقدمات پر اس کی صحیح طور پر سرزنش کی جائے۔اس پر بھی قانون موجود ہے۔اس پر عمل درآمد کروایا جائے۔

میڈیا پر بے راہ روی کے پروگرام اور ترغیبات کی تمام شکلیں ختم کی جائیں۔تعلیمی نصاب اسلامی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے۔ ہر شخص کی رائے اس کی ذات کے لیے قابل قبول ہے مگر اس کو یہ حق نہیں ہے کہ اسلامی طے شدہ اصولوں کی تعلیمات میں اپنی رائے زنی کرے اور اس کے نفاذ پر اصرار کرے۔اس کو ختم ہونا چاہیے۔

نصاب کے لیے مستند علمائے کرام کی سفارشات لی جائیں اور کسی قسم کی بھی تنگ ،تاریک اور روشن خیالی سے پرہیز کیا جائے۔اسلام کے اصول اور تعلیمات طے شدہ ہیں،قوانین موجود ہیں،اس میں تبدیلی وترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں میں بھی فقہ اور بنیادی حقوق کے عنوانات ہر کلاس میں لازمی ہوں تا کہ لوگوں کو صحیح علم سے آشنائی ہو۔

اخلاق بہتر کرنے کا سب سے احسن طریقہ اسلامی تعلیمات پر عمل ہے۔اس سوچ کو معاشرے میں بڑھانا چاہیے اور پھر مقننہ،عدلیہ، پارلیمنٹ،انتظامیہ اپنے اپنے فرائض انجام دیں۔ایک دوسرے کے کام میں مداخلت نہ کریں اور ایک دوسرے کی رائے کا اور اختیارات کا احترام کریں تو اس کے بھی سوسائٹی اور معاشرے پر مثبت اثرات ہوں گے۔اگر ہم فوج کو میٹر چیک کرنے پر،سڑکیں بنانے اور ٹیکس وصولی کرنے پر لگا دیں گے تو پھر وہ صرف یہی کام کر سکے گی۔دفاع میں ہمارا رویہ معذرت خواہانہ ہوتا جائے گا اور ہم دوسری طاقتوں کی ساری باتیں،ساری شرائط فون پر ہی مام لیا کریں گے،جیسا کہ ماضی قریب میں ہوتا آیا ہے۔

ایک طے شدہ اصول ہے کہ کسی ملک میں ٹریفک کا نظام بائیں جانب ڈرائیو کا ہے اور کہیں دائیں جانب ڈرائیو کا۔ یہ انتظامی معاملہ ہے ،اس پر کسی کو اعتراض نہیں

۔اخلاقیات ہر ملک نے اپنی اپنی ثقافت کے حساب سے ترتیب دی ہیں،اس میں دوسرے کو مداخلت کا اختیار نہیں۔ پھر مذہب جیسی حساس چیز پر کیسے دوسرے لوگ ہمارے معاملے میں مداخلت کا حق رکھتے ہیں؟ ہمارا رویہ کیوں معذرت خواہانہ ہے؟ چلو اس شخص کا تو ہو جوان سے مراعات کا طالب ہے اوران سے تحفظ چاہتا ہے اوران کو سب کچھ جانتا ہے،مگر ہم تو اللہ کے ماننے والے ہیں،ہم کسی کو مذہب کی تعلیمات اور حدود اللہ میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتے۔

میری علمائے کرام سے گزارش ہے کہ تعلیمات میں معروف کے تعارف اوراس کے پھیلاؤ پر توجہ دیں،منکرات کی باتوں اورفروعات پر بحث بند کریں۔حدود کی کسی بحث جو کہ قانون سازی سے متعلق ہو،اس میں قطعی طور پر ایسی رائے نہ دیں جس سے اس کی سزاؤں میں تغیر وتبدیل کا شبہ ہو۔صرف اورصرف اطلاق اوراس کی قانونی شقوں کو موضوع بنائیں اوراس میں بھی تعزیر اور حد کا تعین ضرور کریں۔‘‘

پنجاب کے ایک حاضر سروس ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے تاثرات آپ نے انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمالیے۔میں اس ضمن میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ مضمون میں ایک جگہ موصوف کے الفاظ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جن علما سے تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں رائے طلب کی گئی تھی،انہوں نے اسے شرعی قرار دیا ہے۔یہ بات درست نہیں ہے۔میں بھی ان علما میں شامل ہوں۔ہم نے تحفظ حقوق نسواں بل کے اصل مسودے اور قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ دونوں کو سامنے رکھ کر اس بل کی متعدد دفعات کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیا ہے،انہیں درست کرنے کے لیے سفارشات اور تجاویز تحریری صورت میں پیش کی ہیں اوراس کے بعد کہا ہے کہ اگر خصوصی علما کمیٹی کی ترامیم،سفارشات اور تجاویز کو بل میں شامل کر لیا جائے تو اس کے بعد یہ بل شرعی طور پر قابل قبول ہو سکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان،۱۲و۱۳رنومبر۲۰۰۶ء)

تحفظ نسواں بل کے بارے میں

علما اور دینی حلقوں کا موقف

تحفظ نسواں بل سے متعلق علما کمیٹی کی سفارشات

حدود آرڈیننس میں ترامیم بل کے حوالے سے جو بحران پیدا ہوتا نظر آ رہا تھا، وہ بحمد اللہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کی خصوصی حکمت عملی اور توجہ کے باعث باہمی افہام وتفہیم کے ساتھ اصولی طور پر رک گیا ہے اور اگر تحفظ حقوق نسواں بل کو قومی اسمبلی میں دوبارہ پیش کرتے وقت کوئی اور الجھن پیدا نہ ہوئی تو امید ہے کہ اس مسئلے پر کوئی نیا بحران کھڑا نہیں ہوگا اور اس کے ملک کی سالمیت پر بھی دور رس اثرات مرتب ہوں گے۔

پاکستان مسلم لیگ اور متحدہ مجلس عمل کے اس مفاہمتی عمل کے لیے غیر سیاسی علما کی جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس میں راقم الحروف بھی شامل تھا اور سارے مذاکراتی عمل میں شریک رہا۔ اس کے اختتام پر جب پاکستان ٹی وی نے میرے تاثرات دریافت کیے تو میں نے عرض کیا کہ مجھے دو باتوں پر خوشی ہوئی ہے۔ ایک اس بات پر کہ حکمران پارٹی اور متحدہ مجلس عمل نے اس اہم مسئلے پر محاذ آرائی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مفاہمت کے ساتھ یہ مسئلہ حل کرنے کو ترجیح دی ہے اور دوسری بات میرے لیے خوشی کی یہ ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں دنیا کو ایک بار پھر یہ پیغام مل گیا ہے کہ پاکستان اپنے اسلامی تشخص پر اور قرآن وسنت کے ساتھ وفاداری کے عہد پر بدستور قائم ہے اور آج کے عالمی ماحول میں میرے نزدیک یہ بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

حدود آرڈیننس میں ترامیم کا یہ مسودہ جو تحفظ حقوق نسواں بل کے عنوان سے قومی اسمبلی میں زیر بحث ہے اور جس میں قرآن وسنت کے منافی دفعات کی نشاندہی اور اصلاح کے لیے علماے کرام کی یہ کمیٹی بنائی گئی تھی، دراصل اس طویل نظریاتی اور تہذیبی کشمکش کا ایک حصہ ہے جو پاکستان کے نظریاتی اسلامی تشخص کے تحفظ اور پاکستانی معاشرے میں اسلامی اقدار وروایات کی بقا، یا انہیں کمزور کر کے مغربی ثقافت وتمدن کو رواج دینے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہے اور ایک عرصہ تک جاری رہے گی۔ ایک سیکولر دانشور کے نزدیک یہ ''نان ایشو'' ہے لیکن اگر یہ مہم کامیاب ہو جاتی اور ترمیمی بل کے منظور ہو جانے کی صورت میں حدود آرڈیننس محض شو پیس بن کر رہ جاتا تو یہی مسئلہ ہمارے ان دانشوروں کے ہاں ''کرنٹ ایشو'' قرار پاتا اور اسے سولائزیشن اور آزادی کی طرف تاریخی قدم قرار دے کر اس کے حق میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے جاتے۔

مذاکرات کے اس عمل کا آغاز اس طرح ہوا کہ چودھری شجاعت حسین اور مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ایک ملاقات میں اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ کچھ ایسے علما کو بھی حدود آرڈیننس میں اور تحفظ حقوق نسواں بل پر مباحثہ میں شریک کر لیا جائے جو عملی سیاست میں فریق نہ ہوں اور جن کی رائے کو قبول کرنے میں فریقین میں سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے جن علما کے ناموں پر اتفاق رائے ہوا، ان میں جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، ڈاکٹر سرفراز نعیمی اور راقم الحروف شامل ہیں۔ مجھے جب اس بات کی اطلاع دی گئی تو میں نے عرض کیا کہ میرے لیے یہ اعزاز اور سعادت کی بات ہے۔ چودھری شجاعت حسین صاحب نے خود فون پر مجھ سے بات کر کے دریافت کیا تو میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اگرچہ بعض دوستوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ان علماے کرام کے لیے غیر سیاسی، غیر جانبدار اور سرکاری علما کی جو اصطلاحات قومی اخبارات میں استعمال کی گئی ہیں، کیا میرے لیے وہ قابل قبول ہیں؟ اس پر میں نے عرض کیا کہ اس کا تعلق معروضی حالات اور ملی ضروریات سے ہے اور ان دونوں کے تقاضے یکجا ہو جائیں تو مجھے ان میں سے کسی بات میں بھی تامل نہیں ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں

سیاست کو دین کا ایک شعبہ اور دینی ضروریات کا ایک اہم حصہ سمجھتا ہوں۔ اس سے دست برداری یا لاتعلقی میرے نزدیک دین کے ایک حصے سے لاتعلقی ہے، البتہ یہ تقسیم کار کی بات ہے کہ اقتدار اور الیکشن کی سیاست کے لیے خود کو موزوں نہ سمجھتے ہوئے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے فکری اور علمی شعبے کو میں نے اپنی تگ وتاز کا میدان بنایا ہوا ہے۔

میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک عملی انتخابی اور جماعتی سیاست کا ایک متحرک کردار رہا ہوں جبکہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے فکری اور علمی شعبے میں مصروف عمل ہوں۔ اسے اگر غیر سیاسی ہونا کہا جاتا ہے تو ایسا کہنے والوں سے میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟ باقی رہی بات غیر جانبداری کی تو حکومت اور اپوزیشن یا سیاسی جماعتوں کے سیاسی جھگڑوں اور پاور پالیٹکس میں تو غیر جانبدار ہو سکتا ہوں اور کسی حد تک ہوں بھی، مگر دینی وملی مسائل کے بارے میں غیر جانبدار ہونا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے، بالخصوص اسلامائزیشن سے متعلقہ امور میں غیر جانبدار ہو جانا تو شاید بعض صورتوں میں کفر کی حدود تک بھی پہنچا دیتا ہے، البتہ سرکاری علما کی پھبتی بالکل خلاف واقعہ ہے اس لیے کہ ان علما کے نام صرف حکمران پارٹی کی طرف سے نہیں آئے بلکہ قائد حزب اختلاف کی رضامندی بھی اس میں شامل تھی، یہی وجہ ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں ان علمائے کرام نے جو سفارشات دی ہیں، ان میں انہوں نے اپنے کام کے حوالے سے دونوں کا تذکرہ کیا ہے۔

میں اس سارے معاملے کو ایک اور حوالے سے بھی دیکھتا ہوں کہ یہ معاملہ حضرت مولانا مفتی محمود اورؒ چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے بیٹوں کے درمیان ہوا ہے۔ ان دونوں راہنماؤں میں ایک عرصہ تک رفاقت رہی ہے، بالخصوص ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں مولانا مفتی محمودؒ اور چودھری ظہور الٰہی مرحومؒ کا قائدانہ کردار تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ چودھری صاحب مرحوم کٹر مسلم لیگی تھے اور ان کا سیاسی مزاج بھی خالصتاً مسلم لیگی تھا، لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ ملک کے اسلامی تشخص اور دینی امور کے حوالے سے وہ دو ٹوک رائے رکھتے تھے اور ان کے بارے میں عملی طور پر بے لچک ہو جایا کرتے تھے۔ یہ خوبی ان کے سیاسی جانشینوں چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی میں بھی پائی جاتی ہے اور مختلف

مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ قومی وحدت، ملکی سیاست، پاکستان کے اسلامی تشخص اور دینی احکام وروایات کے تحفظ کے بارے میں جو تقاضا ان کی سمجھ میں آ گیا ہے، اس میں انہوں نے کوئی لچک نہیں دکھائی۔

بہر حال اس پس منظر میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے ساتھ میں بھی اسلام آباد حاضر ہوا اور حدود آرڈیننس میں ترامیم کے لیے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے عنوان سے قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے نئے مسودہ قانون پر بحث ومباحثہ میں شرکت کی۔ یہ گفتگو ان علمائے کرام کی وزارت قانون کے اعلیٰ ترین افسران کے ساتھ ہوئی۔ اس میں چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی، سردار نصر اللہ دریشک اور دوسرے اہم حضرات بھی مسلسل شریک رہے۔ علمائے کرام نے مذاکرات کے آغاز سے قبل آپس میں دو باتیں طے کر لیں۔ ایک یہ کہ پاکستانی معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور حقوق کے بارے میں اصل اور عملی مسائل کے بارے میں بھی حکومت کو توجہ دلائی جائے اور چند اہم امور کی نشان دہی کر کے حکومت سے کہا جائے کہ انہیں اس مسودہ قانون میں شامل کیا جائے یا ان کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔ یہ امور درجہ ذیل ہیں:

☆ ہمارے معاشرے میں عام طور پر عورتوں کو وراثت میں ان کا حصہ نہیں ملتا اور وہ خاندانی یا معاشرتی دباؤ کی وجہ سے خاموش رہ کر اپنے حق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے۔

☆ عام طور پر عورتوں کو ان کا مہر بھی نہیں ملتا۔ یا تو کسی حیلے بہانے سے معاف کرا لیا جاتا ہے یا وہ مہر لڑکی کا باپ وصول کر لیتا ہے اور لڑکی کو نہیں ملتا۔ اس کا بھی قانونی طور پر سدباب ضروری ہے۔

☆ بیک وقت تین طلاقیں دے دینا شرعاً بھی ناپسندیدہ ہے اور اس سے بہت سے خاندانی اور معاشرتی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، اس لیے موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یک بارگی تین طلاقیں دینے کو قانوناً قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور اس میں وثیقہ نویسوں اور عرضی نویسوں کو بھی شریک جرم بنایا جائے۔

☆ جبری وٹہ سٹہ جسے شریعت نے ''نکاح شغار'' کا نام دیا ہے، اس کی بھی قانونی ممانعت کی جائے۔

☆ بالغ لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کے جبری نکاح کو قانوناً قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

☆ قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا خاتمہ کیا جائے۔

☆ کاروکاری اور اس طرح کے دیگر غیر شرعی رسوم ورواج کے خاتمے کے لیے قانون سازی کی جائے۔

دوسری بات جو علمائے کرام نے اس میں طے کی تھی، یہ تھی کہ دو تین اصولی اور اہم امور کو پہلے زیر بحث لایا جائے۔ اگر حکومت ان کے بارے میں ہماری بات قبول کرنے کو تیار ہو تو باقی امور پر بات کی جائے، ورنہ مسودہ قانون پر مزید بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں تین باتیں ہمارے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) زنا بالجبر کو نئے مسودہ میں حدود شرعیہ سے نکال کر تعزیر میں شامل کر دیا گیا ہے جو قطعی طور پر غلط ہے۔ اسے حدود میں واپس لایا جائے اور اس کی سزا رجم ہی رکھی جائے۔

(۲) زنا بالرضا میں شرعی شہادتیں پوری ہونے کی صورت میں اس کی سزا حد شرعی یعنی رجم رکھی گئی ہے، لیکن شہادت کا نصاب مکمل نہ ہونے کی صورت میں زنا سے متعلقہ دیگر جرائم کو تعزیرات سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ زنا بالرضا کا اگر شرعی ثبوت نہ بھی مل سکے تو اس سے متعلقہ جو جرائم ثابت ہو چکے ہوتے ہیں، مثلاً مرد اور عورت کی ناجائز خلوت اور دیگر دواعی زنا، ان کے تعزیری احکام کو بحال کیا جائے۔

(۳) حدود آرڈیننس کو باقی قوانین پر بالاتر حیثیت دی گئی تھی، اسے نئے مسودہ قانون میں ختم کر دیا گیا ہے۔ اسے دوبارہ بحال کیا جائے۔

ان تینوں امور پر ہمارا موقف بحمد اللہ تسلیم کر لیا گیا، اس طرح کہ زنا بالجبر کو دوبارہ حدود شرعیہ کے دائرہ میں واپس لے جانے کا فیصلہ ہوا، زنا بالرضا سے متعلقہ قابل تعزیر جرائم کو جرائم کی

فہرست میں دوبارہ شامل کرنے کے لیے تعزیرات پاکستان میں ایک نئی تعزیری دفعہ کا اضافہ تجویز ہوا جس کا متن بھی باہمی مشورے سے طے ہوگیا جبکہ حدود شرعیہ کے قانون کی بالادستی کے لیے ایک متبادل شق کا متن طے کیا گیا جو مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی رائے میں پہلی دفعہ سے زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ ان امور پر اتفاق رائے کو تحریری شکل میں لایا گیا جس میں علمائے کرام نے واضح کیا کہ یہ رائے صرف ان امور کے بارے میں ہے۔ باقی معاملات میں اگر رائے طلب کی گئی تو وہ بعد میں دی جاسکتی ہے۔ اب ان سفارشات کی روشنی میں وزارت قانون تحفظِ حقوق نسواں بل کے قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسودہ میں کیسی ترامیم لاتی ہے، ایک دو روز میں یہ بات بھی واضح ہو جائے گی۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۵ر ستمبر ۲۰۰۶ء)

خصوصی علما کمیٹی نظریہ کونسل کی متبادل نہیں

میرے لیے یہ خبر افسوس اور رنج کا باعث بنی ہے کہ محترم جاوید احمد غامدی نے اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت سے احتجاجاً استعفا دے دیا ہے۔ غامدی صاحب علوم عربیہ کے ممتاز ماہرین میں شمار ہوتے ہیں اور دینی لٹریچر پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر ہے۔ اسلامی نظریہ کونسل میں ایسے فاضلین کی موجودگی بہت سے معاملات میں راہنمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کی فقہی مجلس میں جہاں بحث ومباحثے اور مشترکہ فکری کاوش کے ساتھ مسائل کا فقہی حل تلاش کیا جاتا تھا، مختلف اور متنوع علوم وفنون کے ماہرین شریک ہوتے تھے اور ان کی موجودگی اس بات کی ضمانت سمجھی جاتی تھی کہ مسئلے کے تمام علمی اور فنی پہلوؤں پر غور وخوض کے بعد اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔ محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب نے ایک مستقل کتابچے میں امام ابوحنیفہؒ کی اس فقہی مجلس کا تعارف کرایا ہے جو آج کے دور میں اجتماعی اجتہاد کو آگے بڑھانے کے لیے خاصی راہنمائی مہیا کرتا ہے۔ البتہ محترم جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنے احتجاجی استعفے کی جو وجوہ بیان کی ہیں، ان کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

انہوں نے اپنے استعفے کی دو وجوہ بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ تحفظ حقوق نسواں بل پر مشاورت کے لیے حکومت نے علمائے کرام کی جو کمیٹی بنائی تھی، غامدی صاحب کے نزدیک وہ اسلامی نظریہ کونسل کو بائی پاس کرنے کی ایک صورت تھی جس سے ان کے خیال میں ایک ”آئینی

ادارے'' کا وقار مجروح ہوا ہے اور وہ اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت برقرار رکھنے میں کوئی افادیت نہیں سمجھتے۔ دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے نافذ کردہ حدود آرڈیننس کے بارے میں وہ یعنی غامدی صاحب گزشتہ پچیس تیس سال سے جو کچھ فرماتے آ رہے ہیں، اس کو قبول نہیں کیا جا رہا۔ اس ضمن میں انہوں نے متعدد مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے جن میں ان کی رائے باقی علماء کرام سے مختلف ہے اور انہیں شکایت ہے کہ ان کی رائے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، میں چونکہ اس ''خصوصی علما کمیٹی'' کا ایک ممبر ہوں، اس لیے اس وضاحت کا حق رکھتا ہوں کہ اسے خواہ مخواہ مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ اس سے قبل ایم کیو ایم اور بعض دیگر حلقوں نے علما کی خصوصی کمیٹی کو قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے متوازی قرار دے کر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس کمیٹی کے ذریعے قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کو بائی پاس کیا گیا ہے جو جمہوری اصولوں کے منافی ہے۔

خود ہمارے ساتھ مذاکرات کے دوران ایم کیو ایم کے رہنماؤں جناب فاروق ستار اور ان کے دیگر رفقا نے یہی بات کی تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ علما کی یہ کمیٹی قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کی متبادل یا اس کے متوازی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے اختیارات اور پراسیس کی نفی کر رہی ہے، بلکہ اس کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل پر باہمی تنازعے اور کشمکش کے حوالے سے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور متحدہ مجلس عمل کے سیکرٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ملاقات ہوئی تو مولانا فضل الرحمٰن نے چودھری صاحب سے کہا کہ تحفظ حقوق نسواں بل کی بعض شقوں کے بارے میں متحدہ مجلس عمل کے علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں، اس لیے ان کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر چودھری شجاعت حسین صاحب اور حکومتی حلقے مناسب سمجھیں تو ایسے علما سے بھی رائے لے لیں جن کے بارے میں انہیں اطمینان ہو کہ وہ اس مسئلے سے واقفیت رکھتے ہیں اور موجودہ سیاسی کشمکش میں فریق نہیں ہیں تاکہ ان کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ متحدہ مجلس عمل کے علمائے کرام تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے

ہیں، وہ سیاسی مخاصمت کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ علمی اور دینی حوالے سے ہے۔

اس پر چودھری شجاعت حسین صاحب نے فیصلہ کیا کہ ایسا کرلیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے چند علماء کرام کے نام اس مقصد کے لیے تجویز کیے جن سے مولانا فضل الرحمٰن نے بھی اتفاق کرلیا۔ اس طرح اس غرض کے لیے ۱۔مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ۲۔مولانا حسن جان، ۳۔مولانا مفتی منیب الرحمٰن، ۴۔مولانا مفتی غلام الرحمٰن، ۵۔مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ۶۔مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، اور ۷۔راقم الحروف ابوعمار زاہد الراشدی پر مشتمل ''خصوصی علما کمیٹی'' وجود میں آئی جو صرف اس مقصد کے لیے قائم کی گئی کہ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقا اس بات کی تسلی کرلیں کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں متحدہ مجلس عمل کے علمائے کرام کی طرف سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس کی علمی اور دینی حیثیت کیا ہے۔ چنانچہ اس کمیٹی کے سامنے چودھری صاحب نے یہی بات کی کہ آپ حضرات کو صرف اس لیے زحمت دی گئی ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں جو یہ کہا جا رہا ہے کہ اس میں قرآن وسنت کے منافی باتیں بھی شامل ہیں، اس کے بارے میں آپ حضرات رائے دیں اور اگر آپ کے نزدیک بھی اس بل میں قرآن وسنت سے متصادم کوئی بات ہو تو اس کی نشان دہی کرکے ہمیں سمجھا دیں، کیونکہ یہ بات ہم نے طے کر رکھی ہے اور یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی بات ہم قطعاً نہیں کریں گے۔

سچی بات یہ ہے کہ چودھری شجاعت حسین صاحب اور ان کے ساتھ چودھری پرویز الٰہی صاحب اور ان کے دیگر رفقا کے اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے ہم نے یہ ذمہ داری قبول کی اور باہمی مشاورت میں طے کیا کہ ہم اپنے غور وخوض اور رائے کو صرف اسی اصول تک محدود رکھیں گے، باقی تفصیلات میں جب تک ہمیں دوبارہ نہ کہا جائے نہیں جائیں گے اور پوری دیانت داری اور شرح صدر کے ساتھ اپنی رائے دیں گے۔ اس سلسلے میں لطف کی بات یہ ہے کہ ۶ ستمبر کو عشا کے بعد جب قومی اسمبلی کے کمیٹی روم میں پہلا اجلاس ہوا تو چودھری شجاعت حسین صاحب وفاقی وزرا کی ایک ٹیم کے ساتھ موجود تھے، ایم ایم اے کے علمائے کرام بھی شریک تھے، کمیٹی کے

بیشتر ارکان بھی حاضر تھے، اس کے علاوہ ہمارے دو اور فاضل دوست محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب اور ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب آف مردان (جو غامدی صاحب محترم کے رفیق خاص ہیں) بھی تشریف فرما تھے، جنہیں خاص اس مقصد کے لیے زحمت دی گئی تھی کہ علمائے کرام اگر اس بل کی بعض شقوں پر بات کریں تو موقع پر ہی ان کے ساتھ مباحثہ بھی ہو جائے۔ ہمارے یہ دونوں محترم دوست اس مباحثے کے لیے باقاعدہ تیاری کر کے آئے تھے حتیٰ کہ محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب تو روایتی مناظرین کی طرح کتابوں کی گٹھڑی بھی ساتھ لائے تھے۔

انہوں نے بعض مسائل پر بحث شروع کرنے کی کوشش بھی کی، مگر ہم اس وقت اس قسم کے مباحثے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک تو اس لیے کہ تحفظ حقوق نسواں بل اور اس کے بارے میں قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ہمیں اسی مجلس میں دی گئی تھی جو ہم نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی اور ہم اسے پوری طرح پڑھے بغیر کوئی رائے نہیں دے سکتے تھے۔ دوسرا اس لیے کہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مجلس میں، بلکہ اس وقت ملک میں موجود ہی نہیں تھے اور چونکہ وہ اپنے علم اور تجربے دونوں حوالوں سے اس مسئلے سے زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے ہم ان کی غیر موجودگی میں کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ہم نے دوٹوک کہہ دیا کہ ہم بل اور سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کو پڑھے بغیر کوئی رائے نہیں دیں گے اور چونکہ مولانا محمد تقی عثمانی ۹ ستمبر کو بیرون ملک سے واپس آ رہے ہیں، اس لیے ہم اس بل پر بات کرنے کے لیے ۱۱ ستمبر پیر کو بیٹھ سکیں گے، اس وقت تک ہمیں مہلت دی جائے۔ ہم رائے بھی دیں گے اور اگر کسی علمی مباحثے کی نوبت آئی تو اس میں بھی شریک ہوں گے، کیونکہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ باہمی افہام وتفہیم اور مکالمے ومباحثے کے ذریعے اتفاق رائے کی کوئی صورت اگر ہو سکتی ہو تو پیدا کر لی جائے، مگر اس وقت محترم ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب نے ایک ایسی بات فرما دی جو ہمارے لیے تو حیرت کا باعث بنی ہی، مجلس کے دوسرے شرکا بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد تھا کہ اس مسئلے پر اتفاق رائے نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ قرآن وسنت کی تعبیرات وتشریحات اپنی اپنی ہیں اور ان الگ الگ تعبیرات وتشریحات کے ہوتے

ہوئے متفقہ رائے قائم نہیں ہوسکتی، چنانچہ یہ مجلس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخواست ہوگئی، لیکن جب دوبارہ اس مقصد کے لیے ۱۰ ستمبر کو اسلام آباد کے پنجاب ہاؤس میں مل بیٹھے تو ہمارے سامنے محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب اور ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب تشریف فرما نہیں تھے، بلکہ وزارت قانون کے اعلیٰ افسران ہمارے ساتھ گفتگو کے لیے موجود تھے، جبکہ چودھری شجاعت حسین صاحب، چودھری پرویز الٰہی صاحب اور اس مسئلے پر قائم ہونے والی قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے سربراہ سردار نصر اللہ دریشک بعض دیگر رفقا کے ہمراہ شریک محفل تھے۔ ہم اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کر سکے۔ ویسے بھی ہمیں رائے دینے کے لیے بلایا گیا تھا، مباحثہ ومناظرہ ہمارے ایجنڈے میں شامل نہیں تھا۔ البتہ میرا خیال ہے کہ پہلی نشست میں ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب کا مذکورہ ارشاد گرامی اس تبدیلی کا باعث بنا اور ہم ان دوستوں کے ساتھ اور اس مقصد کے لیے دوبارہ مل بیٹھنے کے موقع سے محروم ہوگئے۔ البتہ ان کی نمائندگی مسلسل ہوتی رہی، چنانچہ وزارت قانون کے افسران کے ساتھ طویل گفتگو اور مباحثے کے دوران ان کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا رہا، وہ محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب اور ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب یا بالفاظ دیگر محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے نقطہ نظر کی ترجمانی پر ہی مشتمل تھا۔

مثال کے طور پر ایک مسئلہ یہ تھا کہ تحفظ حقوق نسواں بل میں حد شرعی کے نفاذ کے حوالے سے زنا بالجبر اور زنا بالرضا کے حکم میں فرق کیا گیا ہے اور زنا بالجبر کو حد شرعی کے دائرے سے نکال کر تعزیرات میں شامل کیا گیا ہے جو ہمارے نزدیک قرآن وسنت کے اصولوں سے متصادم ہے، اس لیے کہ حد شرعی کے نفاذ کے حوالے سے قرآن وسنت نے جبری زنا اور رضامندی کے زنا میں کوئی فرق نہیں کیا، بلکہ احادیث میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح رضامندی سے زنا پر حد شرعی جاری کی ہے، اسی طرح جبری زنا کے ایک کیس میں بھی مجبور کی جانے والی خاتون کو بری کر کے جبر کرنے والے مرد پر شرعی حد جاری کی تھی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عملی فیصلے کے بعد اس سلسلے میں مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، جبکہ وزارت قانون کے ایک اعلیٰ افسر کا اصرار تھا کہ رضامندی کے زنا اور جبری زنا میں حد کے

نفاذ کے سلسلے میں فرق موجود ہے۔ ہم نے حوالہ پوچھا تو فرمایا کہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ''تدبر قرآن'' میں یہ فرق کیا ہے۔ اس پر میں نے ہی ان سے دریافت کیا کہ کیا ان سے پہلے بھی امت میں کسی نے یہ کہا ہے؟ فرمانے لگے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ مولانا فراہیؒ، مولانا اصلاحیؒ اور محترم غامدی صاحب تو ایک ہی چیز ہیں، میں ان سے پہلے امت کے فقہی مذاہب کی بات کر رہا ہوں کہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ظاہری، بلکہ جعفری اور زیدی میں سے کسی فقہی مکتب فکر نے یہ قول کیا ہو تو غور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش رہے تو میں نے عرض کیا کہ جن فقہی مذاہب پر امت مسلمہ کا تیرہ سو سال سے عمل چلا آ رہا ہے، مولانا فراہیؒ یا مولانا اصلاحیؒ کے ایک ''تفرد'' پر یہ سب کچھ قربان نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری یہ گزارش مجلس کے شرکا کی سمجھ میں آ گئی اور طے ہو گیا کہ حد کے بارے میں رضامندی اور جبر کے زنا کا فرق ختم کر دیا جائے اور زنا بالجبر پر بھی شرعی ثبوت کی صورت میں حد جاری کرنے کے قانون کو بحال کیا جائے۔ یہ میں نے صرف ایک مثال دی ہے، ورنہ دو تین روز کی اس محفل میں اس طرح کی اور بہت سی باتیں ہوئی جنھیں کسی اور موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے اس ارشاد سے میں اختلاف کر رہا ہوں کہ علما کی خصوصی کمیٹی کو مشورے کے لیے بلانے سے اسلامی نظریاتی کونسل کے دائرہ کار یا اختیارات پر کوئی اثر پڑا ہے، اس لیے کہ جیسے ہماری کمیٹی قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے متوازی یا متبادل نہیں ہے، اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کے متوازی اور متبادل بھی نہیں ہے۔ ہم نے چودھری شجاعت حسین صاحب کے کہنے پر صرف ایک نکتے پر اپنی رائے دی ہے اور انھی کے کہنے پر وزارت قانون کے اعلیٰ افسران کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم جو رائے دے رہے ہیں، قرآن وسنت کے تعلیمات کا منشا وہی ہے۔ اس سے زیادہ ہمارا کوئی کردار نہیں ہے اور نہ ہماری رائے کو کوئی آئینی اور قانونی درجہ حاصل ہے۔ یہ بل ہماری رائے سمیت دوبارہ سلیکٹ کمیٹی میں جا سکتا ہے، بلکہ قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کا یہ مطالبہ

اخبارات میں آچکا ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کو علما کمیٹی کی سفارشات کے ساتھ سلیکٹ کمیٹی میں دوبارہ بھیجا جائے۔ اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس پر غور کرسکتی ہے اور میری معلومات کے مطابق کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ حکومت اس کے پاس بل نہ بھی بھیجے تو وہ اپنے کسی رکن کی تحریک پر ایسا کرسکتی ہے، اس لیے اس کمیٹی کو اسلامی نظریاتی کونسل کے متوازی قرار دے کر اسے احتجاجی استعفے کی بنیاد بنانا میرے خیال میں درست طریق کار نہیں ہے اور محترم جاوید احمد غامدی صاحب کو اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

باقی رہی بات کسی تعبیر وتشریح کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی تو میں بڑے ادب واحترام کے ساتھ غامدی صاحب سے عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کے لیے صرف کسی صاحب علم کا اسے پیش کر دینا اور اس پر اپنے خیال میں دلائل قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ امت میں اسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ امت میں حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ اور امام بخاریؒ کے درجے کے بیسیوں فقہائے کرام موجود ہیں جن کے علم وفضل اور کردار وتقویٰ کے تمام تر احترام کے باوجود ان کی فقہی آرا اور تعبیرات وتشریحات کو امت نے قبول نہیں کیا، اسی لیے ان پر عمل بھی نہیں ہو رہا تو آج بھی کسی صاحب علم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کی تعبیر وتشریح کو امت میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوئے بغیر واجب العمل سمجھ لیا جائے گا۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۴ ستمبر ۲۰۰۶ء)

تحفظ نسواں بل کے بارے میں

خصوصی علما کمیٹی کا موقف

حدود آرڈیننس میں مجوزہ ترامیم اور قومی اسمبلی میں زیر بحث تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں ۱۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ۲۔ مولانا حسن جان، ۳۔ مولانا مفتی منیب الرحمٰن، ۴۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ۵۔ مولانا مفتی غلام الرحمٰن، ۶۔ مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، اور ۷۔ راقم الحروف ابوعمار زاہد الراشدی پر مشتمل جو خصوصی علماء کمیٹی، پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کے مشورے سے قائم کی تھی، اس نے مختلف مراحل پر اپنی سفارشات تحریری صورت میں چودھری صاحب موصوف کو پیش کی ہیں۔ ان کے کچھ حصے مختلف خبروں اور بیانات کی صورت میں قوم کے سامنے آچکے ہیں، مگر میں چاہتا ہوں کہ یہ تحریں مکمل طور پر ''نوائے قلم'' کے ذریعے عوام کے سامنے آجائیں تاکہ قارئین کی معلومات کا حصہ بننے کے ساتھ ساتھ قومی پریس کے ریکارڈ میں بھی شامل ہوجائیں۔ یہ تین الگ الگ تحریریں ہیں۔

پہلی تحریر ۱۰ ستمبر کو علماء کمیٹی کی طرف سے ابتدائی تجاویز اور تبصرے کے طور پر پیش کی گئی۔

دوسری تحریر چودھری موصوف اور ان کے رفقا کے ساتھ طویل گفتگو اور وزارت قانون کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ بحث ومباحثے کے نتیجے میں ۱۲ ستمبر کو صبح تین بجے کے لگ بھگ مرتب کی

گئی اور اس پر کمیٹی کے ارکان کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین، پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی اور قومی اسمبلی میں تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں قائم کی جانے والی سلیکٹ کمیٹی کے سربراہ سردار نصر اللہ دریشک کے بھی دستخط ہیں، جبکہ تیسری تحریر ۱۰ ستمبر کو خصوصی علما کمیٹی کی طرف سے مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے چودھری شجاعت حسین صاحب کو پیش کی۔

۱۰ ستمبر کو پیش کی جانے والی تحریر

''علما کمیٹی نے اس مسودہ قانون کا جائزہ لیا جو تحفظ نسواں (Protection of Women) بل کے نام سے اسمبلی میں پیش ہوا ہے۔ اس جائزے کے نتیجے میں ہماری گزارشات درج ذیل ہیں:

۱۔ بل کو حقوق تحفظ نسواں کا نام دیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کے ساتھ جو حقیقی زیادتیاں ہو رہی ہیں، ان کے سدِ باب کے لیے قانون سازی نہایت مستحسن اور ضروری اقدام ہے لیکن اس مجوزہ بل میں حدود آرڈیننس کی دفعات میں ترمیم کے سوا خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق کوئی اہم بات موجود نہیں ہے اور حدود آرڈیننس میں جو ترمیمات تجویز کی گئی ہیں، ان میں چند کے سوا کسی سے خواتین کے ساتھ زیادتیوں کے ازالے میں کوئی مدد نہیں ملتی، بلکہ بعض سے ان کی مشکلات میں اضافہ ہوگا، لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بل کا مقصود خواتین کے حقوق کا تحفظ ہے تو اس میں حقیقی مظالم کا سدِ باب ضروری ہے جو ہمارے معاشرے میں واقعتاً خواتین کے ساتھ روا رکھے جا رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشرے میں عملاً عورتوں کو حق وراثت سے بالکل محروم کر دیا گیا ہے، اس بارے میں قانون سازی کی ضرورت ہے کہ خواتین کے حق وراثت کو غصب کرنا قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ نیز بہت سے علاقوں میں خواتین کو ان کی مرضی کے خلاف نکاح پر مجبور کیا جاتا ہے، اس عمل کو بھی قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح اکٹھی تین طلاقیں دے کر خواتین کے لیے جو مشکلات کھڑی کی جاتی ہیں، ان کے سدِ باب کے لیے ایک ساتھ تین طلاقیں دینے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ بہت سے شوہر اپنی بیویوں کو ان کے اعتقاد اور ضمیر

کے خلاف گناہ کے کاموں پر مجبور کرتے ہیں، ان کو بھی قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح قرآن شریف کے ساتھ نکاح، عورتوں کو نکاح کے بہانے بیچنا، نیز وٹہ سٹہ، اور بیواؤں کے نکاح کو معیوب سمجھنا، یہ ساری رسمیں خلاف شرع اور خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی ہیں۔ غرض اگر واقعتاً قانون کا مقصد خواتین کے حقوق کا تحفظ ہے تو ان کے ان جیسے حقیقی مسائل پر توجہ دے کر ان کو قانون کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔

۲۔ اگر چہ مجوزہ بل کے ذریعے حدود آرڈیننس میں بہت سی ترمیمات تجویز کی گئی ہیں، لیکن ان ترمیمات میں بعض امور شریعت کے بھی خلاف ہیں اور خواتین کے ساتھ زیادتی پر بھی مشتمل ہیں۔ مثلاً مجوزہ ترمیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زنا بالجبر کی صورت میں مرد پر حد کی کوئی سزا کسی بھی صورت میں عائد نہیں ہوسکتی اور حد کی سزا صرف اس صورت میں ہوگی جب باہمی رضامندی سے زنا ہو۔ قرآن وسنت کی رو سے زنا بالجبر اور زنا بالرضا میں فرق یہ ہے کہ زنا بالرضا میں اگر مرد اور عورت دونوں کے خلاف زنا کا جرم چار گواہوں یا اقرار سے ثابت ہو جائے تو زنا کی حد دونوں پر جاری ہوگی، البتہ زنا بالجبر کی صورت میں ذمہ داری صرف مرد پر عائد ہوگی۔ یوں بھی زنا بالجبر زیادہ سنگین نوعیت کا جرم ہے، اس لیے اگر زنا بالرضا پر حد جاری ہو رہی ہے تو زنا بالجبر پر بطریق اولیٰ حد جاری ہونی چاہیے۔ جو شخص زبردستی کسی عورت سے زنا کرے، اس کو حد کی سزا سے بالکل چھٹی دے دینا نہ صرف شریعت کے خلاف ہے، بلکہ خواتین کے ساتھ واضح زیادتی ہے۔ حدود آرڈیننس میں ''زنا بالجبر'' کی سزا ''زنا بالرضا'' کے مقابلے میں اس لیے زیادہ رکھی گئی ہے، تعزیر میں بھی اور حد میں بھی۔ یعنی اگر مجرم غیر شادی شدہ ہو تو سو کوڑوں کی حد کے علاوہ عدالت اسے اپنی صوابدید پر کوئی اور تعزیری سزا بھی دے سکتی ہے جو سزائے موت تک ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس کی دفعہ ۶ کو ترمیمی بل میں سے جو حذف کرنے کی تجویز دی گئی ہے، وہ شریعت کے بھی خلاف ہے اور خواتین کے ساتھ بھی زیادتی کا موجب ہوگی۔

۳۔ زنا بالجبر کی سزا حدود آرڈیننس سے ختم کر کے تعزیرات پاکستان میں بطور تعزیر رکھ دی گئی ہے، لیکن زنا بالرضا کی صورت میں اگر حد کی شرائط پوری نہ ہوں تو ملزم کو بالکل آزاد چھوڑ

دیا گیا ہے، حالانکہ اس صورت میں اگر بدکاری کا ثبوت گواہوں وغیرہ سے ہوجائے تو اس پر تعزیری سزا جاری ہونا ضروری ہے۔ حدود آرڈیننس میں اس کو زنا موجب تعزیر (Zina liable to Tazir) قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ترمیم ممکن ہے کہ اس کو زنا کا نام دینے کی بجائے بدکاری یا سیاہ کاری وغیرہ کا کوئی نام دیا جائے، لیکن ایسے مجرموں کو کسی بھی سزا سے آزاد چھوڑنا عملاً زنا بالرضا کی قانونی اجازت کے مترادف ہوگا، کیونکہ حد کی شرائط تو شاذ ونادر ہی کسی مقدمے میں پوری ہوتی ہیں اور اس ترمیم سے ایسی صورت میں تعزیر کا راستہ بالکل بند ہوجائے گا۔

۴۔ حدود آرڈیننس میں حد کے علاوہ بہت سے قابل تعزیر جرائم کو حدود آرڈیننس سے نکال کر تعزیرات پاکستان میں داخل کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک بے ضرر تبدیلی معلوم ہوتی ہے، لیکن ان جرائم کو حدود آرڈیننس میں شامل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جو قابل تعزیر جرائم، قابل حد جرائم سے ملتے جلتے ہیں، ایک ہی عدالت میں ان کا فیصلہ ہو اور عدالتی کارروائی میں پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ مجوزہ ترمیم کے نتیجہ میں عملاً یہ صورت حال ہوگی کہ مثلاً اگر کوئی مجرم زنا کے مقدمے میں بری ہوگیا، لیکن کسی لڑکی کو اغوا کرنے کا وہ مجرم ہے تو زنا کا مقدمہ تو وفاقی شرعی عدالت میں چلے گا۔ وہاں سے بری ہونے کے بعد وفاقی شرعی عدالت اسے اغوا کی سزا نہیں دے سکے گی، بلکہ اس کے لیے دوسری عدالتوں میں نئے سرے سے مقدمہ دائر کرنا ہوگا، جس سے مظلوم خواتین کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔

۵۔ حدود آرڈیننس کی دفعہ ۳ میں کہا گیا ہے کہ اس آرڈیننس کو (Overriding effect) حاصل ہوگا، یعنی اگر اس قانون اور دوسرے قوانین میں تعارض ہو تو حدود آرڈیننس دوسرے قوانین پر بالاتر ہوگا۔ مجوزہ بل میں حدود آرڈیننس کی یہ حیثیت ختم کردی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے متعدد قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو خود خواتین کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہیں۔ مثلاً حدود کا قانون ہر اس نکاح کو معتبر مانتا ہے جو شریعت کے مطابق ہو لیکن مسلم عائلی قوانین آرڈیننس کے تحت چونکہ کوئی طلاق چیئرمین یونین کونسل کو نوٹس بھیجے بغیر قانوناً معتبر نہیں ہوتی، اس لیے نوٹس کے بغیر کوئی عورت عدت کے بعد دوسرا نکاح کرلے تو عائلی قوانین کے تحت وہ نکاح

معتبر نہیں ہوتا۔ یہاں حدود آرڈیننس اور مسلم عائلی قوانین میں تعارض ہے۔ اگر حدود آرڈیننس کو (Overriding effect) نہ دیا جائے تو وہ عورت جس نے جائز شرعی نکاح کیا ہے، محض ایک رسمی کارروائی نہ کرنے کی بنا پر زنا میں سزایاب ہوسکتی ہے۔

۶۔ اس بل کے ساتھ جو بیان اغراض ووجوہ (Statement of Objects) ملحق ہے، اس میں بہت سی باتیں خلاف واقعہ ہیں اور اس میں یہ کہا گیا ہے کہ لعان میں فسخ نکاح کا حق اس فوجداری عدالت کو نہیں ہونا چاہیے جو لعان کی کارروائی کررہی ہے، بلکہ اس کے لیے تنسیخ نکاح کے قانون میں لعان کو وجہ بنا کر وہاں سے نکاح فسخ ہونا چاہیے۔ اس تجویز کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس عورت نے فوجداری عدالت میں لعان کی کارروائی مکمل کی، اس کو نکاح فسخ کرانے کے لیے فیملی کورٹ میں نئے سرے سے کارروائی کرنی پڑے گی، حالانکہ حدود آرڈیننس میں یہ کہا گیا تھا کہ پہلی عدالت ہی نکاح بھی فسخ کردے گی۔ اس میں عورت کو نئے سرے سے دھکے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ چند موٹے موٹے نکات ہیں جو مجوزہ بل کے جائزے کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی مجوزہ بل میں بہت سے امور قابل اعتراض یا غور طلب ہیں، لہٰذا ہم سب کی یہ حتمی رائے ہے کہ اس بل کو عجلت میں منظور کرنا بے شمار مسائل پیدا کرے گا۔ اسے ابھی اسمبلی سے منظور نہیں کرانا چاہیے، بلکہ غیر جذباتی انداز میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر اور تحقیق کے بعد پیش کیا جائے۔ اگر ہماری مذکورہ بالا معروضات منظور ہوں تو ہم بل کا دفعہ وار جائزہ لے کر اپنی مفصل رائے پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

۱۱، ۱۲ ستمبر کو متفقہ طور پر مرتب کی جانے والی تحریر

''قومی اسمبلی میں ''تحفظ حقوق نسواں'' کے عنوان سے حدود آرڈیننس میں ترامیم کا جو بل زیر بحث ہے، اس کے بارے میں پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ملاقات میں طے کی جانے والی

خصوصی علما کمیٹی کا اجلاس گیارہ ستمبر کو اسلام آباد منعقد ہوا جس میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا حسن جان، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی، مولانا زاہد الراشدی، مولانا اخلاق احمد اور حافظ محمد عمار یاسر نے شرکت کی، جبکہ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین کے ہمراہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی، سردار نصر اللہ دریشک اور وزارت قانون کے بعض ذمہ دار حکام نے شرکت کی۔

چودھری شجاعت حسین نے علمائے کرام سے کہا کہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے بارے میں یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اس میں قرآن وسنت کے منافی باتیں بھی شامل ہیں، اس لیے ہم نے آپ حضرات کو زحمت دی ہے کہ بل کا جائزہ لے کر قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں، کیونکہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے جو حدود شرعیہ اور قرآن وسنت کے منافی ہو، بلکہ ہم ایسا سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ اس پر علمائے کرام اور ماہرین قانون نے بل کی متعدد دفعات کا تفصیلی جائزہ لیا جو ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۶ء بروز پیر صبح نو بجے سے کھانے اور نماز کے وقفے کے ساتھ رات تین بجے تک جاری رہا اور اگلے روز ۳ بجے سہ پہر تک بھی مشاورت جاری رہی اور متعدد اصولی امور پر اتفاق رائے ہو گیا جس کے مطابق مندرجہ ذیل معاملات طے پائے:

۱۔ زنا بالجبر اگر حد کی شرائط کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس پر حد زنا جاری کی جائے گی۔

۲۔ حدود آرڈیننس میں زنا موجب تعزیر کی بجائے ''فحاشی'' کے عنوان سے ایک نئی دفعہ کا تعزیرات پاکستان (PPC) میں اضافہ کیا جائے گا جس کا متن درجہ ذیل ہے:

Willfully have sexual intercourse with one another without being married and shall be punished with imprisonment which may extend to five years and shall also be liable to fine.

۳۔ زنا آرڈیننس کی دفعہ تین کی جگہ مندرجہ ذیل دفعہ تحریر کی جائے گی:

In the interpretation and application of this ordinance, the injunctions of Islam as laid down in the Holy Quran and Sunnah shall have affect notwithstanding anything contained in any other law for the time being in force.

اجلاس میں شریک علمائے کرام نے کہا کہ حقوق نسواں بل کے بارے میں قرآن وسنت کے حوالے سے اصولی امور پر اتفاق رائے ہوگیا ہے اور اب اس بل میں اصولی طور پر قرآن وسنت کے منافی کوئی بات باقی نہیں رہی، تاہم بعض ذیلی امور پر اگر ہمیں مزید وقت دیا گیا تو تفصیلی سفارشات پیش کردی جائیں گی۔"

اس متفقہ تحریر کے ساتھ خصوصی علما کمیٹی کی طرف سے یہ سفارشات بھی اس کے ساتھ شامل کی گئیں:

"پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقا کو ممتاز علماء کرام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، ابوعمار زاہد الراشدی، مولانا اخلاق احمد اور حافظ محمد عمار یاسر نے مشورہ دیا ہے کہ اگر حکومت واقعی پاکستان میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے عملی پیش رفت کرنا چاہتی ہے تو اسے مندرجہ ذیل قانونی اقدامات کرنے چاہییں:

۱۔ خواتین کو عملاً وراثت میں عام طور پر محروم رکھا جاتا ہے، اس کے سدِ باب کے لیے مستقل قانون بنایا جائے۔

۲۔ بعض علاقوں میں خواتین کو ان کی مرضی کے خلاف نکاح پر مجبور کیا جاتا ہے، اس کی روک تھام کے لیے قانون سازی کی جائے اور اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

۳۔ بیک وقت تین طلاقیں دینے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور ایسی دستاویز لکھنے والے نوٹری پبلک اور وثیقہ نویس کو بھی شریک جرم قرار دیا جائے۔

۴۔ قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا سدِ باب کیا جائے۔

۵۔ جبری وٹہ سٹہ یعنی نکاح شغار کو قانوناً جرم قرار دیا جائے۔

۶۔ عورتوں کی خرید وفروخت اور انہیں میراث بنانے کے غیر شرعی رواج اور رسوم کا قانونی سدِ باب کیا جائے۔"

۱۷ر ستمبر کو چودھری شجاعت حسین کو پیش کی جانے والی تحریر

''۱۰ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو علما کمیٹی نے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے بارے میں جن تین بنیادی نکات پر دستخط کیے تھے، ان کے آخر میں یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ اصولی طور پر ان نکات پر اتفاق رائے کے بعد کچھ ذیلی امور اور ہیں جن پر اگر کمیٹی کو وقت دیا گیا تو کمیٹی ان پر اپنی رائے ظاہر کرے گی، نیز زبانی طور پر یہ طے ہوا تھا کہ ان تین نکات کو مسودے میں سمونے کے لیے بل میں تبدیلیوں کے بعد اسے ہمیں دکھایا جائے گا، چنانچہ ۱۳ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو اس غرض کے لیے جب کمیٹی کو دوبارہ اسلام آباد طلب کیا گیا تو ہم نے نئے مسودے کا جائزہ لے کر یہ محسوس کیا کہ اگرچہ وہ تین نکات اس مسودے میں شامل کر لیے گئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسے امور کا اضافہ کر دیا گیا ہے جن کے بعد ان تین نکات کے عملاً موثر ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی تشویش سے حکومت کے نمائندہ حضرات کو نہ صرف زبانی طور پر آگاہ کر دیا بلکہ ان پر تفصیلی گفتگو بھی ہوئی۔ ہمیں آخر وقت تک یہ امید تھی کہ کم از کم ان میں سے چند اہم نکات پر ہماری تجویز مان لی جائے گی، لیکن آخر وقت میں جو مسودہ انتہائی شکل میں سامنے لایا گیا، اسے دیکھ کر واضح ہوا کہ ان میں سے کوئی بات مسودے میں شامل نہیں کی گئی۔ اگرچہ اس وقت ہم نے زبانی طور پر اپنا یہ تاثر واضح کر دیا تھا، لیکن ان نکات کو تحریری طور پر مرتب کرنے کا وقت نہیں مل سکا تھا۔ اب ہم ذیل میں ان نکات کو تحریری شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ بل کو بامعنی اور موثر بنانے کے لیے ان تجاویز پر عمل کیا جائے گا:

۱۔ تعزیرات پاکستان میں دفعہ ۴۹۶۔ بی کا جو اضافہ کیا جا رہا ہے، اس کے عنوان اور متن میں Fornication کا لفظ طے شدہ لفظ Lewdness کے بجائے بدل دیا گیا ہے۔ اسے بدل کر Siyahkari یا Lewdness کرنا ضروری ہے، کیونکہ Fornication صرف غیر شادی شدہ افراد کے ''زنا'' کو کہتے ہیں۔ اس بات سے زبانی طور پر اتفاق کر لیا گیا تھا، مگر آخری مسودے میں اس کو یقینی بنانا ضروری ہے۔

۲۔کمیٹی نے جب اپنی سابقہ سفارش میں یہ کہا تھا کہ زنا بالجبر پر بھی حد نافذ کی جائے تو اس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ حدود آرڈیننس کی دفعہ ٦ میں ''زنا بالجبر'' موجب حد کی جو تعریف اور جو احکام درج ہیں، انہی کو بحال کیا جائے، لیکن نئے مسودے میں اس کے بجائے وہاں دوسری تعریف درج کردی گئی ہے اور اس کے نتیجے میں سولہ (١٦) سال سے کم عمر لڑکی کو نابالغ قرار دے کر اس کی مرضی کو غیر معتبر قرار دیا گیا ہے، حالانکہ شرعاً بلوغ کے لیے علامات بلوغ (Puberty) کافی ہیں اور اس کے بعد اس کی رضامندی شرعاً معتبر ہے، لہٰذا ہمارے نزدیک زنا آرڈیننس کی دفعہ ٦ کو جوں کا توں بحال کردینا ضروری ہے اور اگر موجودہ دفعہ برقرار رہے تو مجوزہ مسودے کی دفعہ ١٢۔اے کی ذیلی دفعہ (v) اس طرح بنائی جائے:

with or without her consent when she is nonadult.

۳۔مجوزہ مسودے کی دفعہ ١٢۔بی کے ذریعے جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء میں دفعہ ٦۔اے کا اضافہ کرنے کی تجویز دی گئی ہے جو ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے اور اس سے وہ متفقہ امور غیر موثر ہو جائیں گے جن پر ہماری پہلی نشست میں اتفاق رائے ہوا تھا۔تمام فوجداری قوانین میں یہ بات مسلم رہی ہے کہ اگر ملزم پر بڑا جرم ثابت نہ ہو سکے تو وہی عدالت ملزم کو کمتر جرم کی سزا دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کمتر جرم اس پر ثابت ہو جائے، لیکن نہ جانے کیوں جرم زنا بالجبر اور زنا بالرضا کو اس اصول سے مستثنٰی رکھا گیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی خاتون نے ملزم کے خلاف زنا بالجبر موجب حد کا مقدمہ درج کرایا ہو لیکن عدالت کے سامنے موجب حد جرم ثابت نہ ہو سکا تو عدالت اس خاتون کی فریادرسی کے لیے ملزم کو تعزیری سزا نہیں دے سکتی۔اس کے لیے اس کو یا دوبارہ مقدمہ دائر کرنا ہوگا یا پھر ظلم پر صبر کر کے بیٹھ جانا ہوگا۔

لہٰذا ہمارے نزدیک آرڈیننس میں دفعہ ٦۔اے کا اضافہ کرنے کی جو تجویز دی گئی ہے، وہ قطعی غیر منصفانہ اور غلط ہے اور اسے حذف کرنا ضروری ہے اور اسے حذف کرنے کے نتیجے میں جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس کی دفعہ ۲۰ کی پہلی Proviso کو بحال رکھنا بھی ضروری ہے جسے مجوزہ بل میں حذف کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔

۴۔مجوزہ مسودے کے پیرا گراف نمبر ۳ میں ۲۰۳۔سی کا اضافہ کرنے کی تجویز دی گئی ہے اور اس کی ذیلی دفعہ ۲ میں استغاثہ درج کرانے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ مستغیث دو عینی گواہ پیش کرے۔اول تو یہ تعزیری جرم ہے اور اس کے لیے مناسب یہ ہوتا کہ اسے قابل دست اندازی پولیس (Cognizable) قرار دے کر اس کے غلط استعمال سے بچنے کے لیے کم از کم ایس پی کے درجے کے پولیس آفیسر کو تفتیش کا اختیار دیا جاتا اور عدالت کے وارنٹ کے بغیر گرفتاری کو ممنوع کر دیا جاتا، لیکن اگر کسی وجہ سے اس کو استغاثہ (complaint) کا کیس بنانا ضروری سمجھا جائے تو دو عینی گواہوں کی شہادت پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے، کیونکہ تعزیر کے ثبوت کے لیے دو عینی گواہ ضروری نہیں ہوتے، بلکہ ایک قابل اعتماد گواہ کی قرائنی شہادت Circumstantial Evidence بھی کافی ہوتی ہے، لہٰذا ہماری نظر میں اس دفعہ میں at least two eye witnesses کے بجائے evidence available as such لکھنا چاہیے۔

۵۔جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء کی دفعہ ۷ کو زیر نظر مسودے سے حذف کر دیا گیا ہے، اس کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ہمارے نزدیک جن امور پر اتفاق رائے ہوا تھا، ان کے موثر نفاذ کے لیے مندرجہ بالا پانچ ترمیمات نہایت ضروری ہیں اور ان کے بغیر ان متفقہ امور کے غیر موثر ہو جانے کا قوی خدشہ ہے، لہٰذا مذکورہ اتفاق رائے کے بعد زیر نظر مسودے سے ہمارا اتفاق ان ترمیمات پر موقوف ہے۔امید ہے کہ مسودے کو بامعنی بنانے کے لیے یہ ترمیمات مسودے میں شامل کر لی جائیں گی۔

اس کے علاوہ ہم نے زیر نظر بل کے بارے میں شروع ہی میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ اس کا نام تو تحفظ حقوق نسواں بل ہے، مگر اس میں ساری بحث زنا آرڈیننس سے متعلق ہے اور خواتین کے حقیقی مسائل اور حقوق کو اس میں چھیڑا ہی نہیں گیا، چنانچہ ہم نے خواتین کے حقیقی مسائل سے متعلق جو سفارشات پیش کی تھیں، ان کے بارے میں ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ ان پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔اللہ تعالیٰ صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔آمین“

(روزنامہ پاکستان، ۱۴ و ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

وقت کی آواز

سینیٹر مولانا سمیع الحق نے سینٹ آف پاکستان میں ''تحفظ نسواں بل'' میں دس ترامیم پیش کر کے ان اہم امور کی آن ریکارڈ نشان دہی کر دی ہے جو مذکوہ بل میں دینی نقطہ نظر سے متنازع ہیں اور جن کی موجودگی میں ملک بھر کے دینی حلقے اس بل کو قرآن وسنت کے منافی قرار دے کر اس کے خلاف مسلسل احتجاج کر رہے ہیں۔ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کا جو مسودہ قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی نے منظور کیا تھا، اس پر پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے سرکردہ علمائے کرام سے رائے لی تھی۔ اس میں علمائے کرام نے واضح طور پر چند اہم امور کی نشاندہی کر دی تھی کہ ان میں ترامیم اور ردوبدل ضروری ہے اور علمائے کرام کی مجوزہ سفارشات اور تجاویز کو بل میں شامل کیے بغیر اسے شرعی طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان سفارشات اور ترامیم کو قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس بل کو متنازع صورت میں قومی اسمبلی سے منظور کرانے کے بعد ملک بھر کے ذرائع ابلاغ، این جی اوز اور لابیوں کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ قومی اسمبلی کے منظور کردہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو قرآن وسنت کے عین مطابق ثابت کرنے اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ناگزیر قرار دینے کے لیے دن رات ایک کر دیں، لیکن خدا بھلا کرے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کا کہ انہوں نے ایک جامع تجزیاتی مضمون کے ذریعے سے اس بل کی شرعی حیثیت کو واضح کر دیا اور مولانا سمیع الحق نے بھی سینٹ میں دس ترامیم پیش کر کے اتمام حجت کا اہتمام کیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ تعجب کا باعث چودھری شجاعت حسین کا رویہ بن رہا ہے کہ

انہوں نے نہ صرف یہ کہہ کر قومی اسمبلی کے اسپیکر کو مشروط استعفا پیش کیا کہ اگر اس بل میں کوئی بات شریعت کے خلاف ہے تو قومی اسمبلی کی رکنیت سے ان کا استعفا منظور کیا جائے بلکہ اس کے بعد سے وہ مسلسل ملک بھر کے علمائے کرام کو چیلنج دیے جا رہے ہیں کہ اگر کوئی اس بل کی کسی شق کو قرآن وسنت سے متصادم ثابت کر دے تو وہ مستعفی ہو جائیں گے، مگر ہمارے خیال میں چودھری صاحب موصوف کو یہ فیصلہ کرانے کے لیے کہ بل میں کوئی دفعہ قرآن وسنت کے خلاف موجود ہے یا نہیں، نہ قومی اسمبلی کے اسپیکر سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی علمائے کرام کو چیلنج پر چیلنج دیے جانے کی کوئی تک ہے، اس لیے کہ اس امر کا فیصلہ خود ان کی جیب میں موجود ہے جسے صرف جیب سے نکال کر پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہ وہ فیصلہ ہے جس پر چودھری شجاعت حسین نے خود اپنے طلب کردہ علمائے کرام کے ساتھ صبح نو بجے سے رات تین بجے تک مسلسل مذاکرات کے بعد دستخط ثبت کیے تھے اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے اسے قومی پریس کے حوالے کیا تھا۔ اگر چودھری صاحب کو وہ دن اور رات یاد ہے اور اپنے دستخطوں کو وہ پہچانتے ہیں تو پھر کسی اور کو انھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ خود اس بل کی متعدد دفعات کو قرآن وسنت سے متصادم تسلیم کر چکے ہیں، بلکہ اس پر انہوں نے اپنی حلیف جماعتوں کو قائل کرنے کی مسلسل کوشش بھی کی ہے۔ ہمیں اس بات پر چودھری شجاعت حسین سے ہمدردی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا موقف اپنی حلیف سیاسی جماعتوں سے نہیں منوا سکے اور ملک کے اصل حکمرانوں کو اس کے لیے اپنا ہم نوا نہیں بنا سکے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الٹا علمائے کرام پر غصہ نکالنے اور انہیں بلاوجہ مورد الزام ٹھہرانے میں شب وروز مصروف ہو جائیں۔ ہم چودھری صاحب کا احترام کرتے ہیں، لیکن ان سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنے غصے پر کنٹرول نہیں کر پا رہے تو وہ اسے اس کی صحیح جگہ پر نکالیں جہاں ان کی بات نہیں مانی گئی اور انہیں آخر وقت تک قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے مسودے سے بے خبر رکھ کر ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے ان کی ساری تگ ودو کو ناکام بنا دیا گیا ہے۔ اس کے لیے علمائے کرام کو چاند ماری کی مشق کا نشانہ بنانا ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے سوا اور کوئی تاثر پیدا نہیں کر رہا۔

''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو دینی حلقوں اور علمائے کرام کی رائے کے علی الرغم بین الاقوامی سیکولر لابیوں کی خواہش کے مطابق منظور کرا کے اسے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی فتح قرار دیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اب ملک میں انتہا پسندوں کی بات نہیں چلنے دی جائے گی، مگر یہ بات خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے کہ حکومت اور طاقت کے زور سے کسی قانون کو ملک پر مسلط کر دینا اور بات ہے، اور قوم سے اسے ذہنی طور پر قبول کرانا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کا تجربہ اب سے کم وبیش نصف صدی قبل بھی کیا جا چکا ہے جو ناکام ثابت ہوا ہے، مگر ہمارے حکمران اس تجربہ کی ناکامی سے کوئی سبق حاصل کرنے کے بجائے اسے ایک بار پھر دہرانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ صدر محمد ایوب خان کے دور میں جب عائلی قوانین کے نام سے نکاح، طلاق اور وراثت کے شرعی قوانین کو ردوبدل کا نشانہ بنایا گیا تھا، تب بھی مغرب کا فکر وفلسفہ اور مغربی قوتوں اور لابیوں کے تقاضے ہی پیش نظر تھے۔ اس کے لیے ایک ''عائلی کمیشن'' بنا تھا جس میں دینی حلقوں کی نمائندگی صرف ایک عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی کی صورت میں تھی۔ اس کمیشن نے خاندانی نظام کے قوانین وضوابط کو مغربی سسٹم کے قریب لانے کے لیے قرآن وسنت کے کچھ احکام کا جھٹکا کرنا چاہا تو حضرت مولانا تھانوی نے رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی اور کمیشن پر واضح کیا کہ قرآن وسنت کے واضح احکام میں ردوبدل کی اجازت نہیں دی جا سکتی، مگر کمیشن کے ارکان نہیں مانے تو کمیشن کے اس واحد عالم دین رکن نے کمیشن کی رپورٹ پر دوٹوک اختلافی نوٹ لکھ کر اپنا فرض پورا کیا۔

حکومت نے مولانا احتشام الحق تھانوی کے اس اختلافی نوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے قانون اور حکومت کے زور پر عائلی قوانین ملک میں نافذ کر دیے، مگر ساری دنیا اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہی ہے کہ نصف صدی کے قریب عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ قوانین اب بھی قوم میں متنازعہ ہیں۔ جہاں تک قانون کا جبر کام کرتا ہے، اس سے زیادہ عائلی قوانین کا کوئی اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ لوگ اب بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے احکام میں مسائل علمائے کرام ہی سے پوچھتے ہیں اور انہی پر عمل کرتے ہیں۔ قوم نے ان قوانین کو آج تک سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ ہی

انہیں ذہنی طور پر قبول کیا ہے اور اس سلسلے میں صرف ایک مثال سے معروضی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عائلی قوانین کے تحت نکاح کے رجسٹریشن فارم میں ''تفویض طلاق'' کے خانہ کا اضافہ کیا گیا تھا جس میں نکاح کے وقت خاوند سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟ اس سوال کو نکاح فارم میں درج کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغرب کو مطمئن کیا جائے کہ ہم نے بھی عورت کو طلاق کا حق دے دیا ہے، لیکن آپ ملک کے کسی بھی حصے میں نکاح کی کسی تقریب میں نکاح فارم پُر کرنے والے نکاح رجسٹرار اور اس پر دستخط کرنے والے ایک درجن کے لگ بھگ افراد سے پوچھ لیں کہ کیا انہوں نے تفویض طلاق کے اس خانہ کو پر کرنے کے لیے کوئی سوال وجواب یا مشاورت کی ہے؟ عام طور پر نکاح رجسٹرار ہی اس خانہ میں 'ہاں' یا 'نہ' لگانے کا فریضہ اپنی طرف سے انجام دے دیتا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے عائلی قوانین کے بارے میں قوم کی سنجیدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہمیں اس بارے میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' حکومت کی طاقت سے نافذ ہو جانے کے باوجود عوام میں ایک ''جائز قانون'' کے طور پر کبھی قبولیت حاصل نہیں کر سکے گا اور جب تک علمائے کرام کی سفارشات اور تجاویز کے مطابق اس بل کو دوبارہ مرتب کر کے منظور نہیں کرایا جاتا، یہ شرعی طور پر متنازعہ ہی رہے گا، البتہ اس بل کے ذریعے سے فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دینے کا جو راستہ اختیار کیا گیا ہے، وہ ضرور قابل تشویش ہے اور اس کی روک تھام کے لیے دینی حلقوں کو اپنا کردار موثر طریقے سے ادا کرنا ہوگا۔

قومی اسمبلی میں اس بل کے پیش ہونے کے بعد امریکی وزارت خارجہ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اسلام آباد کا امریکی سفارتخانہ پاکستان میں تحفظ ختم نبوت کے قوانین، تحفظ ناموس رسالت کے قانون اور حدود آرڈیننس کو ختم کرانے کے لیے حکومت اور ارکان اسمبلی سے مسلسل رابطے میں ہے اور اب جبکہ تحفظ حقوق نسواں بل کو متنازعہ صورت میں منظور کر لیا گیا ہے، امریکی حکومت کے افسر نے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ باقی دو قوانین کے بارے میں بھی جلد پیش رفت ہوگی۔ اس کے بعد اس بل کے مقاصد اور اس سلسلے میں حکومت کے

آئندہ پروگرام کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا اور اس عمل کو موثر بریک لگانے کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ جس طرح ملک کے دینی حلقوں نے ماضی میں تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت کے لیے فرقہ وارانہ تفریق اور سیاسی گروہ بندی سے بالاتر ہوکر مکمل دینی اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ پوری قوم کی رہنمائی اور نمائندگی کی تھی، اب اس فضا کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور پاکستان کے اسلامی تشخص اور اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے متحد ہوکر نئی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی جائے۔

گزشتہ روز جامعہ اشرفیہ لاہور میں سرکردہ علمائے کرام نے مجتمع ہوکر اس مقصد کے لیے ''مجلس تحفظ حدود اللہ'' کے نام سے جو غیر سیاسی فورم قائم کیا ہے اور ۲۷ر نومبر کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہی ملک گیر سطح پر علمائے کرام اور دینی کارکنوں کا قومی کنونشن طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے، وہ صحیح سمت میں بروقت فیصلہ ہے جسے کامیاب بنانے کے لیے ملک کے تمام مکاتب فکر کے رہنماؤں، علمائے کرام، دانشوروں اور کارکنوں کو بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ یہ دینی جدوجہد کا ناگزیر تقاضا اور وقت کی آواز ہے جسے علمائے کرام اور دینی کارکنوں نے بروقت محسوس کرلیا تو امید ہے کہ پاکستان کے دینی تشخص اور پاکستانی معاشرے کی دینی اقدار کو طاقت کے زور سے بلڈوز کرنے کی تازہ کوشش بھی ان شاء اللہ ان کے ایمان اور عزم کا سامنا نہیں کر سکے گی۔

(روزنامہ اسلام، ۲۴ر نومبر ۲۰۰۶ء)

’’مجلس تحفظ حدود اللہ‘‘ کا قیام اور متحدہ مجلس عمل کی ریلی

’’تحفظ حقوق نسواں بل‘‘ کے بارے میں اسلامی نظریہ کونسل کی حالیہ رائے، مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کی طرف سے ’’مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان‘‘ کے قیام کے ساتھ اس بل کے خلاف جدوجہد کے اعلان اور متحدہ مجلس عمل کی لاہور سے گجرات تک ریلی کے بعد اس سلسلے میں صورت حال خاصی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے، مگر اس حوالے سے کچھ عرض کرنے سے قبل ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ تحفظ حقوق نسواں بل کی منظوری کے فوراً بعد ۱۸ رنومبر کو شائع ہونے والے اپنے اسی کالم میں راقم الحروف نے لکھا تھا کہ اس بل کے ذریعے ’’زنا بالرضا‘‘ کی صورت میں بھی شرعی حد (سنگسار یا سوکوڑے) ختم کر دی گئی ہے اور اس طرح زنا کے جرم میں شرعی حد کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ اسی کالم میں یہ وضاحت بھی موجود تھی کہ ابھی تک بل کا اصل متن سامنے نہیں ہے اور اس تاثر کی بنیاد صدر جنرل پرویز مشرف کی نشری تقریر کا یہ جملہ ہے کہ ’’زنا بالرضا‘‘ کے معاملے میں چار گواہوں کی شرط ختم کر دی گئی ہے اور ماہرین قانون اور پاکستان مسلم لیگ کے ارکان اسمبلی نے غور وخوض کے بعد ۴۹۶۔بی کی دفعہ متعارف کرائی ہے جس کے تحت زنا بالرضا پر پانچ سال سزا ہو سکتی ہے۔

صدر محترم کے اس ارشاد سے نہ صرف ہم نے، بلکہ موقر معاصر ’’نوائے وقت‘‘ کے اداریہ نگار نے بھی یہی مفہوم سمجھا کہ زنا بالرضا پر شرعی حد ختم کر کے پانچ سال قید کی سزا مقرر کر دی گئی ہے، لیکن بعد میں بل کا متن سامنے آنے پر معلوم ہوا کہ یہ تاثر درست نہیں ہے اور اس نئے قانون میں زنا بالرضا کی صورت میں مکمل شرعی ثبوت فراہم ہونے پر حد شرعی (سنگسار یا سوکوڑے) کی سزا

بحال رکھی گئی ہے، البتہ زنا کا مکمل ثبوت فراہم نہ ہونے کی صورت میں اس سے نچلے درجے کے جرائم کو فحاشی کا عنوان دے کر ان پر پانچ سال تک قید کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رائے کی طرف آتے ہیں جو گزشتہ روز صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کونسل کے اجلاس میں دی گئی ہے اور اس میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اخباری رپورٹ کے مطابق ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کی حمایت کر دی ہے۔ اس سے قبل کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کا یہ بیان اخبارات کی زینت بن چکا ہے کہ اسلامی نظریہ کونسل نے تحفظ حقوق نسواں بل پر باقاعدہ طور پر غور نہیں کیا اور ان سمیت کونسل کے بعض ارکان نے ذاتی طور پر اپنی رائے دی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق اس کے بعد بھی ''تحفظ حقوق نسواں بل'' باقاعدہ رائے کے لیے کونسل کو نہیں بھجوایا گیا اور کونسل کی رائے اس بل کے حق میں شو کرنے کے لیے صدر جنرل مشرف کی صدارت میں اسلامی نظریہ کونسل کے اجلاس کا اہتمام ضروری سمجھا گیا، جبکہ اجلاس میں شریک ہونے والے کونسل کے ایک رکن محترم جاوید احمد غامدی کی طرف سے یہ وضاحت آئی ہے کہ وہ کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو چکے ہیں اور صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت منعقد ہونے والے اجلاس میں انہوں نے اس لیے شرکت کی ہے کہ ان کا استعفا ابھی منظور نہیں ہوا مگر اجلاس میں انہوں نے اس بل کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔

اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی نظریہ کونسل نے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کی حمایت کی ہے تو اس کی اخلاقی اور قانونی حیثیت کے بارے میں مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، البتہ کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود کی رائے اور پوزیشن اس سے ضرور واضح ہو گئی ہے۔ ہم نے کچھ عرصہ قبل ایک کالم میں ان سے گزارش کی تھی کہ وہ ملک کے دینی و سیکولر حلقوں کے درمیان اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جاری کشمکش میں فریق بننے کی بجائے توازن اور اعتدال کا راستہ اختیار کریں، مگر انہوں نے درمیان میں رہنے کی بجائے ان دانشوروں کی صف میں کھڑا ہونا پسند کر لیا ہے جو عورت کے بارے میں مغرب اور مسلمانوں

کے درمیان موجودہ فکری وتہذیبی تنازع میں مغرب کو اس کی غلطیوں کی طرف توجہ دلانے کی بجائے قرآن وسنت کے احکام وقوانین میں ردوبدل کر کے انہیں مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نظریہ کونسل اور اس کے چیئر مین کی موجودہ پوزیشن کا تعلق ہے، اسے دیکھ کر صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں قائم ہونے والا ''ادارۂ تحقیقات اسلامی'' یاد آنے لگا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھے اور انہوں نے بھی دین کی تعبیر وتشریح کے بارے میں یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا جو اب ڈاکٹر خالد مسعود اور ان کے رفقا نے اپنایا ہے۔

اس وقت بھی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی شخصیت اپنے تمام جاہ وجلال کے ساتھ ان کی پشت پر تھی اور تمام سرکاری وسائل ان کے ساتھ تھے، لیکن ملک کے دینی حلقوں اور عوام کو ان کا یہ رویہ برداشت نہیں ہوا تھا اور جب عوام سڑکوں پر آ گئے تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ہی میدان چھوڑنا پڑا تھا۔ دوسری طرف ملک کے تمام معروف دینی حلقے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے خلاف صف آرائی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ۲۷ رنومبر کو منعقد ہونے والے ''تحفظ حدود اللہ کنونشن'' میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع کے سرکردہ علماء کرام نے مجتمع ہو کر اس بل کے خلاف بھرپور یک جہتی کا اظہار کیا ہے، جبکہ جامعہ نعیمیہ لاہور میں اس کے دو روز بعد بریلوی مکتب فکر کے علماء کرام بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنا موقف تسلسل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص نوٹ کرنے کی ہے کہ حکومتی حلقے ملک بھر میں کسی جگہ بھی دینی مکاتب فکر کے معروف حلقوں میں سے کسی ایک عالم دین کی حمایت بھی اس بل کے لیے حاصل نہیں کر سکے اور تمام مکاتب فکر اس مسئلے میں مکمل اتحاد اور ہم آہنگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کا قیام اسی یک جہتی کے اظہار کی عملی صورت ہے جسے پورے ملک میں ضلعی سطح پر منظم کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ ۱۰ دسمبر کو کراچی میں تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام، مشائخ عظام اور دینی کارکنوں کے بھرپور اور نمائندہ کنونشن کا اعلان کر دیا گیا ہے جس میں ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے تنظیمی ڈھانچے اور آئندہ جدوجہد کے لائحہ عمل کا

فیصلہ کیا جائے گا۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اس سلسلے میں متحرک کردار ادا کر رہے ہیں اور ہمارا اندازہ ہے کہ جن لائنوں پر وہ کام کر رہے ہیں، اگر اس کا تسلسل جاری رہا تو وہ تحریک تحفظ ختم نبوت کی طرز پر ملک کے دینی حلقوں کو متحد کرنے اور سڑکوں پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اب متحدہ مجلس عمل کی ریلی کے معاملات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ حکومتی حلقوں نے اسے ناکام قرار دیا ہے لیکن اس ''ناکامی'' کے لیے صوبائی حکومت کو جو پاپڑ بیلنے پڑے ہیں، اس پر لاہور سے گجرات تک کے عوام عینی شاہد ہیں۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ مجھے اس روز پسرور سے سیالکوٹ جانے والے راستے پر واقع گاؤں ''لوہارکے'' میں ظہر کے بعد طالبات کے ایک مدرسے میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی تقریب میں شریک ہونا تھا۔ وہیں کے ایک دوست گاڑی پر مجھے وہاں لے گئے۔ جب ہم پسرور پہنچ کر سیالکوٹ روڈ کی طرف مڑے تو پولیس کے ناکے پر ہمیں روک لیا گیا۔ ناکے کے انچارج پولیس آفیسر کوئی صاحب بہادر قسم کے تھے۔ انہوں نے ایک اہل کار کو بھیجا کہ مولوی صاحب کو کہو کہ انہیں آفیسر بلا رہے ہیں۔ میں نے اپنے میزبان ساتھی سے کہا کہ وہ جا کر صاحب بہادر کی بات سن لیں۔ وہ گئے تو پوچھا گیا کہ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ لوہارکے جا رہے ہیں۔ صاحب بہادر نے کہا کہ ادھر تو سیالکوٹ ہے۔ گویا ہمارا سیالکوٹ جانا ان کے نزدیک ''جرم'' تھا۔ ہمارے ساتھی نے جواب دیا کہ ہم لوہارکے جا رہے ہیں اور میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ اس دوست نے عقل مندی سے کام لیا کہ میرا تعارف نہیں کروایا، ورنہ شاید ہماری یہ بات تسلیم نہ کی جاتی کہ ہم واقعی سیالکوٹ نہیں بلکہ لوہارکے جا رہے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم نے ڈسکہ کے راستے گوجرنوالہ واپسی کا پروگرام بنایا تو ڈسکہ میں نہر کے پل پر ٹریفک بلاک تھی۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ ناکہ بندی کی وجہ سے پل بلاک ہے اور ادھر سے سر دست گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک نکلنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ مغرب کے قریب کا وقت تھا، چنانچہ ہم نہر کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر چلتے ہوئے نہر کے اگلے پل تک پہنچے اور گلوٹیاں سے ہوتے ہوئے گوجرانوالہ واپس آ سکے۔

متحدہ مجلس عمل کی ریلی نے لاہور سے جی ٹی روڈ پر گجرات جانا تھا مگر جی ٹی روڈ سے کم از کم پچاس کلومیٹر دور پسرور میں ناکہ بندی کا یہ حال تھا تو خود لاہور، گوجرانوالہ اور گجرات کا کیا حال ہوگا؟ لوہار کے میں دوستوں نے ہمیں بتایا کہ آج ادھر ٹریفک بند ہے اوران کے بقول ویگن ڈرائیور کو اس ''جرم'' میں پولیس اہلکاروں سے مار پڑی ہے کہ وہ گاڑی سڑک پر کیوں لایا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود متحدہ مجلس عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد نے گوجرانوالہ میں ریلی سے خطاب کیا ہے اوران کی گرفتاری کے بعد ریلی کے کچھ حضرات تمام ترکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے گجرات تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اسے ''ناکام'' کہنے کا اعزاز چودھری پرویز الٰہی اور جناب محمد علی درانی ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ بہرحال ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے حوالے سے ایک نئی صورت حال سامنے آرہی ہے جو اس حوالے سے نئی نہیں ہے کہ دینی حلقے مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے ایک بار پھر متحد ہوکر سامنے آرہے ہیں۔ اس سے قبل تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے لیے کئی بار ایسا ہو چکا ہے، جبکہ امریکی وزارت خارجہ کی ایک حالیہ رپورٹ میں حدود آرڈیننس کو بھی تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے قوانین کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے حکومت پاکستان پر ان قوانین کے خاتمے کے لیے زور دیا گیا ہے۔ البتہ اس حوالے سے یہ صورت حال ضرور نئی ہے کہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا خاندان اس بار دینی حلقوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے، حالانکہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم تحریک ختم نبوت میں بھی دینی حلقوں کے ساتھ تھے اور تحریک نظام مصطفیٰؐ کے تو قائدین میں شامل تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی، صدر پرویز مشرف کا قرب حاصل کرنے اور پیپلز پارٹی کو مات دینے کی مہم میں چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی روایات سے کہاں تک دامن چھڑا سکتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۴ر دسمبر ۲۰۰۶ء)

مجلس تحفظ حدود اللہ کا کنونشن

''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے کراچی کنونشن کے بعد اس سلسلہ میں جدوجہد نے جو صورتحال اختیار کرلی ہے، وہ بہت سے حوالوں سے غور طلب ہے اور دینی حلقوں سے سنجیدہ توجہ کا تقاضا کر رہی ہے۔ حکمران حلقوں نے اس حوالے سے واضح موقف اختیار کرلیا ہے کہ انہوں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے خیال میں ''تحفظ حقوق نسواں'' کے عنوان سے نافذ شدہ ایکٹ پر نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ گزشتہ دنوں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام نے مشترکہ طور پر جو نئی یادداشت چودھری شجاعت حسین صاحب سے خود مل کر ان کے حوالے کی ہے، ☆ اسے بھی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی بلکہ حکمران جماعت نے چودھری صاحب ہی کی زیر صدارت اجلاس میں ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ '' کی ایک قرارداد کے ذریعے تحسین کرتے ہوئے اس پر نظر ثانی کے دروازے کو بند کر دیا ہے اور حکمران جماعت کے اس اجلاس کے حوالہ سے جو خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے، اس میں یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ منظور شدہ ایکٹ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ البتہ چودھری شجاعت حسین صاحب نے حقوق نسواں کے تحفظ کے نام سے جو نیا بل اسمبلی میں جمع کرایا ہے، اس کے لیے علمائے کرام سے مشاورت ہوسکتی ہے اور ان کی کچھ تجاویز کو اس میں شامل کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اس مجوزہ بل میں جو باتیں شامل کی گئی ہیں وہ دراصل علماء کرام ہی کی وہ تجاویز ہیں جو انہوں نے پاکستانی معاشرہ کے معروضی تناظر میں خواتین کو درپیش حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پیش کی تھیں۔ اس طرح محسوس یوں ہوتا ہے کہ یہ نیا بل لاکر دراصل علمائے کرام کا

منہ بند کرنے اور اس کے ذریعے تحفظ حقوق نسواں کے منظور شدہ متنازعہ ایکٹ کو ہضم کرانے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے جو ایک خطرناک چال ہے اور اس کا مقصد ان امور کے بارے میں علمائے کرام کو خاموش کرانا ہے جو وہ منظور شدہ متنازعہ ایکٹ میں قرآن وسنت کے صریح احکام کی خلاف ورزی کے طور پر قوم کے سامنے لا رہے ہیں۔ مجھ سے گزشتہ روز ایک ذریعے سے دریافت کیا گیا ہے کہ چودھری شجاعت حسین صاحب کے پیش کردہ نئے بل کے بارے میں اگر علمائے کرام کو مشاورت کے لیے بلایا جائے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ میں نے گزارش کی کہ جب تک منظور شدہ ''حقوق نسواں ایکٹ'' کا تنازعہ صاف نہیں ہوتا اور اس کے بارے میں علمائے کرام کے اعتراضات دور نہیں کیے جاتے، اس وقت تک نئے بل کے بارے میں کوئی بات کرنا درست نہیں ہوگا۔ یہ منظور شدہ ایکٹ کی خلاف اسلام باتوں سے توجہ ہٹانے کی ایک کوشش ہوگی جس سے علمائے کرام کو بہرحال بچنا چاہیے اور ذاتی طور پر میں کسی ایسی مشاورت میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہوں جس میں متنازعہ ایکٹ کی خلاف شریعت باتوں پر خاموشی اختیار کرتے ہوئے نئے بل کو قابل قبول بنانے کے لیے گفتگو کا اہتمام کیا گیا ہو۔

متنازعہ ایکٹ کی منظوری کے بعد بعض وفاقی وزرا نے اپنے باس سمیت علمائے کرام اور دینی حلقوں کے بارے میں جو توہین آمیز لب ولہجہ اختیار کر رکھا ہے، وہ بجائے خود ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ کے نزدیک حدود شرعیہ کو غیر موثر بنانے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ مسئلہ اہم ہے کہ علمائے کرام کی کردار کشی کی جائے، ان کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم کو تیز کیا جائے اور عوامی حلقوں میں دین کی تعبیر وتشریح کے حوالہ سے علمائے کرام کا جو اعتماد موجود ہے، اسے کسی نہ کسی طرح ختم کر کے قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کو آزادانہ ماحول میں ریاستی اداروں اور حکمران طبقہ کی صوابدید کے دائرہ میں شامل کر دیا جائے کہ وہ جب چاہیں، جس طرح چاہیں، قرآن وسنت کے کسی مسئلہ کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر اسے اسلام اور قرآن وسنت کے نام سے ملک کے قانون ونظام کا حصہ بنا سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس میں کامیابی حاصل ہوتی ہے یا نہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ نہیں ہوگی، اس لیے کہ قرآن کریم اور اس

کی زبان تک بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیرات وتشریحات اور سنت وحدیث تک عام مسلمان کو رسائی میسر ہے اور دینی مدارس کے وسیع ترنیٹ ورک کی برکت سے کوئی بھی مسلمان کسی بھی وقت یہ معلوم کر سکتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت یا فلاں جملے کا ترجمہ کیا ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل کے ساتھ اس کی کیا تشریح کی ہے، صحابہ کرامؓ نے اس پر کس انداز سے عمل کیا ہے اور امت کے جمہور فقہا نے اس کا کیا مطلب ومفہوم سمجھا ہے؟ جب تک ایک عام مسلمان کی ان چاروں امور تک رسائی کے مواقع موجود ہیں، قرآن وسنت کے کسی حکم کی غلط تشریح اور اسے من مانے مفہوم کے ساتھ امت سے قبول کرانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا تجربہ اس سے قبل امت میں بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ اب بھی اس ناکام تجربہ کو ایک بار پھر دہرایا جا رہا ہے لیکن پہلے کی طرح اب بھی یہ تجربہ کامیابی کی دہلیز پار نہیں کر سکے گا۔

علمائے کرام اور دینی حلقوں کی کردار کشی اور ان کے خلاف منافرت کی مہم بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جو حضرات برطانوی استعمار کے تسلط کے دور میں علمائے کرام اور دینی کارکنوں کے خلاف چلائی گئی مکروہ پراپیگنڈا مہم اور معاشرہ میں انہیں کارنر کرنے کی مسلسل تگ ودو سے واقف ہیں، وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ مہم آج کی مہم سے زیادہ سخت اور صبر آزما تھی اور اس وقت کے محمد علی درانی اور شیر افگن صاحبان کی زبانیں زیادہ لمبی تھیں، جبکہ علمائے کرام اور دینی حلقوں کے پاس اپنے دفاع اور اپنا موقف پیش کرنے کے مواقع آج سے کہیں کم تھے، اس کے باوجود سوسائٹی سے علمائے کرام کا تعلق منقطع کرنے اور انہیں کارنر کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس لیے ان دو حوالوں سے تو تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر مجھے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہے اور میرا طالب علمانہ وجدان یہ کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن وسنت اور امت کے اجماعی علمی ماضی کے ساتھ نئی پود کا رشتہ اور کمٹمنٹ زیادہ مضبوط ہو گی بلکہ علمائے کرام اور دینی حلقے بھی آزمائش کی اس نئی بھٹی سے گزر کر پہلے سے زیادہ مضبوط پوزیشن حاصل کریں گے۔ میری پریشانی اس جدوجہد میں علمائے کرام کے کردار، طرز عمل اور حکمت عملی کے بارے میں ہے اور میں اس کے دو پہلوؤں پر کچھ گزارش کرنا چاہوں گا۔

ایک پہلو یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام، دینی قائدین اور مذہبی راہ نما علمی اور فکری طور پر اس مہم کو پوری سنجیدگی کے ساتھ ڈیل نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں دینی حلقوں کے ارباب فکر و دانش کی درجنوں محافل میں شرکت کا موقع ملا ہے اور میں نے ان محافل میں شریک علمائے کرام، خطبا اور دینی کارکنوں کی کم وبیش پچانوے فیصد اکثریت کو اصل مسئلہ سے بے خبر پایا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ حدود آرڈیننس کیا تھا؟ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کیا ہے؟ کن مسائل میں تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ اعتراضات کیا ہیں؟ پس منظر کیا ہے؟ مقاصد کیا ہیں؟ اور اس ایکٹ کی منظوری کے بعد ملک کے قانونی نظام اور معاشرتی ماحول میں کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی؟ اس سلسلہ میں بعض اہل علم نے سنجیدہ کام کیا ہے اور بہت سے مفید مضامین اور کتابچے سامنے لائے گئے ہیں مگر کسی کو پڑھنے کی فرصت نہیں ہے اور کسی کے نظام الاوقات میں مطالعہ، تحقیق اور غور وفکر کی گنجائش نہیں ہے۔

ملک کے تین چار بڑے شہروں سے دوستوں کے فون گزشتہ ہفتے کے دوران موصول ہوئے ہیں اور ہر جگہ کے احباب کا کہنا ہے کہ حقوق نسواں ایکٹ کے حوالہ سے ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے اور تنازعہ کی نوعیت اور تفصیلات کیا ہیں۔ ایک شہر سے فون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم شہر کے بڑے بڑے دینی اداروں میں گئے ہیں، ہمیں کہیں سے صحیح معلومات نہیں مل رہی ہیں اور صورت حال واضح نہیں ہو رہی ہے۔ ایک صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ کا جامع مضمون کم وبیش تمام قومی اخبارات میں شائع ہوا ہے، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے مضامین شائع ہوئے ہیں، میرے درجنوں مضامین روزنامہ 'اسلام' اور روزنامہ 'پاکستان' میں شائع ہو چکے ہیں اور دیگر بہت سے اصحاب قلم کی نگارشات قومی پریس کے ذریعہ مسلسل سامنے آ رہی ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہمارے علمائے کرام، خطبائے عظام، دینی راہ نماؤں، مدرسین، ائمہ مساجد حتیٰ کہ اس جدوجہد میں فرنٹ لائن کے لوگوں یعنی اسمبلیوں کے ممبر علمائے کرام کے پاس بھی ان مضامین پر ایک نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہے۔

ایک دوست نے بتایا کہ ٹی وی کے مختلف چینلز پر اس مسئلے پر جو مباحثے یا انٹرویو ہوئے ہیں،

ان میں مولانا مفتی تقی عثمانی یا مولانا مفتی منیب الرحمٰن کے سوا کسی گفتگو میں ان سوالات کا جواب موجود نہیں تھا جو تحفظ حقوق نسواں بل کے سلسلہ میں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیے گئے ہیں۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے والے حضرات کی گفتگو میں سطحیت، جذباتیت اور معروضی صورت حال سے بے خبری صاف صاف دکھائی دیتی ہے جو کسی پبلک جلسے میں تو چل جاتی ہے لیکن گفتگو کی میز پر، جہاں دوسری طرف سے استدلال اور معلومات کا کھلا استعمال ہو رہا ہو، اس طرز کی گفتگو اکثر اوقات فائدہ کی بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہے اور اس سے گفتگو کرنے والوں کی علمی تہی دامنی کا تاثر زیادہ اجاگر ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دلائل موجود نہیں ہیں یا معلومات میسر نہیں ہیں یا ان تک رسائی کے مواقع مہیا نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ موجود ہے مگر ہمارے پاس فرصت نہیں ہے کہ ہم خود کو اس کے لیے محنت اور تگ و دو پر تیار نہیں کر پا رہے۔ اس ماحول میں اتنی بڑی جنگ لڑنا بہت مشکل کام ہے اور ہمیں بہر حال اپنے اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

میری پریشانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد کے دینی اور سیاسی ماحول کو گڈ مڈ کرتے جا رہے ہیں جو بہت زیادہ نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ آج کا ماحول اور اس کی پیچیدگیاں دیکھ کر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقا کی اس بصیرت پر میرا یقین اور زیادہ پختہ ہو گیا ہے جو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد کو سیاسی کشمکش سے الگ تھلک کر کے خالصتاً دینی اور علمی بنیادوں پر آگے بڑھانے کے لیے اختیار کی تھی اور بالآخر انہی لائنوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے یہ جدوجہد کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ مجھے جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہونے والے اس فیصلہ سے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کی منظوری کے بعد ملک میں قرآن وسنت کے احکام وقوانین کی شکل بگاڑنے اور نافذ شدہ چند شرعی قوانین کو ختم کرنے کی جو سرکاری مہم پورے زور وشور کے ساتھ شروع کر دی گئی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی طرز پر تمام مکاتب فکر کے دینی راہ نماؤں پر مشتمل ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' قائم کی جائے گی جو خالصتاً غیر سیاسی

بنیادوں پر اس مقصد کے لیے رائے عامہ کو منظّم کرے گی اور تمام دینی وسیاسی جماعتوں کے راہ نماؤں سے رابطہ کر کے اس جدوجہد کو صحیح معنوں میں قومی تحریک بنانے کی کوشش کرے گی۔ اس جدوجہد کا یہی فطری راستہ ہے اور اسے اسی طریقہ سے موثر طور پر آگے بڑھایا جا سکتا ہے، مگر یہ بات مجبوراً لکھنا پڑ رہی ہے کہ دھیرے دھیرے اس جدوجہد کا یہ پہلو مجھے پس منظر میں جاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جو بہرحال پریشانی کی بات ہے۔ متحدہ مجلس عمل اپنے فورم سے اس مقصد کے لیے جو جدوجہد کر رہی ہے، وہ لائق تحسین ہے اور ہر دینی کارکن کو اس کی سپورٹ کرنی چاہیے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت اس جدوجہد کو جس انداز سے تقویت پہنچا رہی ہے، وہ قابل داد ہے اور اس کا یہ کردار جاری رہنا چاہیے لیکن عوامی محاذ پر اس تحریک کی قیادت ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' ہی کو کرنی چاہیے اور اسے صرف ٹائٹل تک محدود رکھنے کی بجائے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی طرح کل جماعتی ''مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان'' کے نام سے منظّم کیا جانا ضروری ہے۔ اس کا باقاعدہ ڈھانچہ تشکیل دیا جائے، اس کی قیادت میں تمام مکاتب فکر کو ذمہ دارانہ نمائندگی دی جائے اور اسے ایک مستقل فورم کی شکل دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ ملک کے عوام کو متحدہ مجلس عمل، مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے درمیان فرق واضح طور پر دکھائی دے، ورنہ بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور یہ پیچیدگیاں اس جدوجہد میں پیش رفت کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہیں۔

(روزنامہ اسلام، ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۶)

خواتین کے حقوق اور دینی طبقے کی ذمہ داریاں

پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے گزشتہ روز قومی اسمبلی میں حقوق نسواں کے تحفظ کے حوالے سے ایک اور بل پیش کر دیا ہے جس میں عورتوں کو وراثت سے محروم رکھنے، ان کی جبری شادی، قرآن کریم کے ساتھ شادی کے نام سے انھیں نکاح کے حق سے محروم کرنے اور ونی جیسی معاشرتی رسموں اور رواجوں کو قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ بل جسے ''خواتین دشمن روایات ایکٹ ۲۰۰۷'' کا نام دیا گیا ہے، دراصل ان تجاویز پر مشتمل ہے جو ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کے حوالے سے چودھری شجاعت حسین کی تجویز پر قائم ہونے والی ''علما کمیٹی'' نے خود چودھری شجاعت صاحب اور ان کے رفقا کے ساتھ مذاکرات کے دوران میں اس عنوان سے پیش کی تھیں کہ تحفظ حقوق نسواں بل میں تو خواتین کے حقوق نام کی کوئی چیز شامل نہیں، بلکہ زنا کے راستے میں رکاوٹیں دور کر کے اس بل میں عورتوں کی عصمت وعزت کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے، اس لیے اگر حکومت واقعتاً عورتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی ہے تو ہمارے معاشرتی تناظر میں عورتوں کے حقوق یہ ہیں کہ انھیں وراثت میں حصہ دلوانے کا اہتمام کیا جائے، ان کی جبری شادی کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے، بعض علاقوں میں موجود ان کی خرید وفروخت کا رواج ختم کیا جائے اور ان کو مہر کی رقم دلوانے کی قانونی ضمانت دی جائے، وغیر ذلک۔

حکومت نے تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے حوالے سے علما کمیٹی کی سفارشات کو تو تسلیم نہیں کیا اور اسے اسی قابل اعتراض صورت میں پارلیمنٹ سے منظور کروا لیا ہے جس پر نہ صرف متحدہ مجلس عمل کو شدید اعتراض ہے بلکہ ملک بھر کے دینی حلقوں اور اس سلسلے میں خود حکومتی حلقوں کی

تجویز کردہ علما کمیٹی نے بھی اسے مسترد کر دیا ہے اور اب بھی باقاعدہ قانون کی شکل اختیار کر لینے کے باوجود تحفظ حقوق نسواں ایکٹ سنجیدہ دینی و علمی حلقوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے، البتہ اب اسے بیلنس کرنے کے لیے علما کمیٹی ہی کی سفارشات کو ''خواتین دشمن روایات بل'' کے عنوان سے قومی اسمبلی میں پیش کر دیا گیا ہے جسے قومی اسمبلی نے بحث کے لیے منظور کر لیا ہے اور اسے سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے جو اس کے مسودہ کو حتمی شکل دے گی جبکہ اپوزیشن نے اس مرحلہ پر اس کی مخالفت نہیں کی۔

جہاں تک اس بل کے مشمولات کا تعلق ہے، چونکہ وہ خود ہماری تجاویز پر مشتمل ہیں اور ہمارے معروضی معاشرتی تناظر میں عورتوں کو درپیش حقیقی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ہم اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس بل کی منظوری سے ''تحفظ نسواں ایکٹ'' بیلنس نہیں ہوگا اور اس پر قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ہمارے اعتراضات اور تحفظات بدستور قائم رہیں گے جن کے لیے علمی و دینی حلقوں کی جدوجہد بدستور اسی طرح جاری رہے گی جیسے صدر محمد ایوب خان مرحوم کے نافذ کردہ عائلی قوانین کی قرآن وسنت کے منافی شقوں کے خلاف جدوجہد چلی آ رہی ہے۔

اس موقع پر ہم عورتوں کو وراثت میں حصہ دلوانے کے لیے قانونی اور سماجی جدوجہد کے پس منظر سے قارئین کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں یہ جدوجہد کم وبیش پون صدی سے زیادہ عرصے سے جاری ہے۔ ہمارے ہاں رواج کے نام سے عورتوں کو وراثت کا حق دار نہیں سمجھا جاتا اور اس رواج کی جڑیں ہندو روایات تک پھیلی ہوئی ہیں جن کے مطابق باپ کی وراثت کا حق دار صرف بیٹا تصور ہوتا تھا اور بیٹی کو شادی کے موقع پر جہیز کے نام سے کچھ دے دلا کر باپ کی جائیداد میں وراثت کے حق سے فارغ کر دیا جاتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں شادی کے موقع پر لڑکیوں کو بھاری جہیز دینے کا جو رواج ہے، اس کے پس منظر میں دونوں تصور کارفرما ہیں۔ سنت نبوی کا تصور بھی موجود ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو شادی کے موقع پر گھریلو استعمال کی چند اشیا مرحمت فرمائی تھیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچ بھی موجود

ہے کہ لڑکی کو چونکہ باپ کی جائیداد سے کچھ نہیں ملتا، اس لیے اسے جہیز کے نام پر شادی کے موقع پر کچھ دے دلا کر فارغ کر دیا جائے۔ چنانچہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی شادی شدہ خاتون باپ کی وفات کے بعد وراثت کے حصے کا تقاضا کرتی ہے تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ تمھیں جہیز میں جو کچھ دیا گیا تھا، وہی تمھارا باپ کی وراثت میں حصہ ہے جبکہ شرعی پوزیشن یہ ہے کہ جہیز سے وراثت کا حق ادا نہیں ہوتا اور عورت کو جہیز ملے یا نہ ملے، باپ کی وفات پر اس کی جائیداد میں شرعی طور پر مقرر کردہ حصے پر اس کا حق برقرار رہتا ہے، مگر ہمارے ہاں عورت کو نہ صرف یہ کہ باپ کی جائیداد میں حصہ نہیں ملتا بلکہ خاوند، بیٹے یا بعض صورتوں میں بھائی کی وراثت سے بھی اسے محروم رکھا جاتا ہے اور اس کے لیے اس کی طرف سے معاف کر دینے اور دست بردار ہو جانے کے بعض حیلے ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہیں۔

اس مسئلے پر سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے توجہ فرمائی۔ جب انھیں توجہ دلائی گئی کہ پنجاب میں عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا تو انھوں نے ایک ''تبلیغی مہم'' کا آغاز کیا اور خانقاہ تھانہ بھون کے مفتی حضرت مولانا عبد الکریم گمتھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو پنجاب کے مختلف علاقوں میں تبلیغی مہم کے لیے روانہ فرمایا جنھوں نے علمائے کرام، مسلمانوں کی انجمنوں اور راہ نماؤں سے ملاقاتوں کے علاوہ عوامی اجتماعات سے خطاب کر کے لوگوں کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی کہ عورتوں کو وراثت میں حصہ دینا شرعی طور پر ضروری ہے اور انھیں اس سے کسی بھی طرح محروم رکھنا غصب اور ظلم شمار ہوتا ہے جو سخت گناہ کی بات ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ''ظلم پنجاب کے متعلق خدائی وصیت'' اور ''غصب المیراث'' کے نام سے دو پمفلٹوں میں مسئلے کی پوری طرح وضاحت کر کے اس کی ہزاروں کاپیاں تقسیم کرائیں۔ حضرت مولانا مفتی عبد الکریم گمتھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے پنجاب کے دو تفصیلی سفر کیے۔ پہلا سفر انھوں نے تنہا ۱۹۲۴ء میں کیا جبکہ ۱۹۲۵ء میں دوسرے سفر میں حضرت مولانا عبد المجید بچھرایونی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ حضرت تھانویؒ کے اس فتویٰ اور جدوجہد کی تفصیل حضرت مولانا مفتی عبد القدوس ترمذیؒ نے ''غصب

المیراث'' کے نام سے ایک کتابچے میں شائع کر دی ہے جو مسئلہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ دل چسپ تاریخی معلومات پر مشتمل ہے اور اسے ادارہ اشرف البیان، جامعہ حقانیہ، ساہیوال ضلع سرگودھا سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے کی دوسری کوشش ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ جب برطانوی حکومت کے تحت صوبائی خود مختاری کے عنوان سے انتخابات ہوئے اور مختلف صوبوں میں قانون ساز اسمبلیاں وجود میں آئیں تو صوبہ سرحد کی اسمبلی میں ''شریعت بل'' کے عنوان سے ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا کہ صوبہ سرحد کے عام رواج کے مطابق لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا، اس لیے قانونی طور پر لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ عورتوں کو شریعت اسلامیہ کے مطابق ان کا حصہ ادا کریں۔ یہ بل جب صوبائی قانون ساز اسمبلی میں پیش ہوا تو اسے حسب ضابطہ ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کیا گیا جس کے سربراہ مجلس قانون ساز کے ممبر سر جارج کنگھم تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں مسلمان علماے کرام سے راہ نمائی کے لیے رابطہ کیا تو ایک اشکال سامنے آیا کہ کیا برطانوی حکومت سے اور برطانوی نوآبادیاتی نظام سے شریعت اسلامیہ کے کسی قانون کے نفاذ کا مطالبہ درست ہے یا نہیں اور علماے کرام کو اس سلسلے میں سلیکٹ کمیٹی سے تعاون کرنا چاہیے یا نہیں؟

اس وقت جمعیۃ علماے ہند کی صوبہ سرحد شاخ کے صدر حضرت مولانا شاکر اللہ صاحبؒ تھے اور ان سے بھی سلیکٹ کمیٹی نے اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا۔ انھوں نے مفتی اعظم ہند اور جمعیۃ علماے ہند کے مرکزی قائد حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی خدمت میں راہ نمائی کے لیے استفسار بھیجا کہ مجھے سلیکٹ کمیٹی کی اس فرمایش پر کیا کرنا چاہیے؟ مولانا شاکر اللہؒ کا یہ استفسار یکم جولائی ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کے جواب سمیت ''کفایت المفتی'' میں موجود ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے جمعیۃ علماے ہند کے صوبائی صدر مولانا شاکر اللہؒ کو جواب میں لکھا کہ:

''اس کمیٹی کے سامنے آپ شہادت میں یہ بیان دیں کہ قرآن مجید کی رو سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ خدا کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے، ورنہ وہ مسلمان نہیں

رہے گا۔ اس کے لیے آیت کریمہ 'فلا و ربك' الخ اور 'الم تر الی الذین آمنوا' الخ اور دیگر آیات پیش کریں۔ پھر یہ بتائیں کہ جو رواج شریعت اسلامیہ کے صریح خلاف ہو، اس کو بمقابلہ شریعت اختیار کرنا مسلمان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے، اس لیے مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اسلامی احکام کے موافق وراثت، نکاح، طلاق وغیرہ کے مقدمات فیصل کیے جائیں اور چونکہ حکومت برطانیہ کا وعدہ اور اس کا اصول بھی یہی ہے کہ وہ کسی مذہب میں دست اندازی نہ کرے گی، بلکہ رعایا کے ہر طبقہ کو اس کے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد رکھے گی، اس لیے حکومت ہند کو ایک منٹ کے لیے بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ وہ مجوزہ بل پاس کر دے۔''

دوسری طرف صوبہ سرحد کے بعض خوانین نے اپنے سابقہ رواج کے تحفظ کے لیے اس ''شریعت بل'' کی مخالفت کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ چونکہ اس بل میں مکمل شریعت کا نفاذ نہیں کیا گیا بلکہ جزوی طور پر ایک شرعی مسئلہ کے نفاذ کی بات کی گئی ہے، اس لیے یہ شریعت اسلامیہ کی توہین ہے اور ناقابل قبول ہے۔ ان کی درخواست کا متن ڈیرہ اسماعیل خان کے حضرت مولانا قاضی خان محمدؒ نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کو بھجوایا۔ اس درخواست میں خوانین کی طرف سے لکھا گیا ہے کہ:

''۱۔ اگر گورنمنٹ عالیہ کی منشا ہم مسلمانان سرحد کو شریعت دینے کی ہے تو ہم استدعا کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی روحانی و دنیاوی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے، وہ تمام تر قرآن پاک اور احادیث نبوی کے مطابق ہو یعنی اقامت دین، تجدید اصلاح وتعزیر، حدود، صیغہ محاصل وصیغہ عدالت غرضیکہ کیا عقائد، کیا اخلاق، کیا عشر وزکوٰۃ، کیا دیوان، کیا دفتر بیت المال، ہر ایک چیز اسلامی صورت پر ہو۔ قتل کے بدلے قتل، آنکھ کے بدلے آنکھ، زنا میں سنگساری، مرتد کے لیے قتل، مرتدہ کے لیے عمر قید وجائیداد سے محرومی، اگر یہ تمام باتیں عطا کی جاویں تو ہم لوگ گورنمنٹ عالیہ کے شکرگزار ہوں گے۔

۲۔ اگر شریعت بل کے نام سے بعض مسلمان اراکین مجلس واضع قانون بعض سیاسی

مصلحتوں کو ملحوظ رکھ کر اس کا نفاذ چاہتے ہیں تو ہم کو معاف رکھیں کیونکہ ہمارے مذہب پاک کی تذلیل ہوگی۔ موجودہ قانون رواج کے ماتحت اس وقت بھی کوئی مسلمان شرع محمدی پر اناث کو حصہ دے تو کوئی قانونی ممانعت نہیں۔ اگر تمام شرع شریف جیسا کہ اوپر عرض کر چکے ہیں، گورنمنٹ عالیہ عطا نہیں کرتی تو پھر ہمارا قانون رواج ہے، مسلم شخصی قانون ہرگز نہیں۔ بالفرض اگر مجوزہ شریعت بل کونسل میں کثرت رائے سے منظور ہو بھی جائے تو ہم کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔''

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے اس کا تفصیلی جواب تحریر فرمایا ہے جو ''کفایت المفتی''میں موجود ہے اور اس کا خلاصہ خود حضرت مفتی صاحبؒ کے قلم سے یہ ہے کہ:

''یہ درخواست شریعت سے بھاگنے اور رواج پر قائم رہنے کا ایک حیلہ ہے اور حیلہ بھی ایسا کہ جس کا بطلان آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ اس کے مرتکب فاسق تو یقیناً ہیں اور ان کے اسلام میں بھی شدید خطرہ۔ انھیں فوراً توبہ کرنی چاہیے اور خدا اور رسول کے سامنے سر اطاعت جھکا دینا چاہیے۔''

اس حوالے سے یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ کیا کافروں کی حکومت سے شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کا قانون کے طور پر نافذ کرنے کا مطالبہ درست ہے؟ اس کا جواب ''کفایت المفتی''میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان ''الجمعیۃ'' کی ۲۰/فروری ۱۹۳۵ء کی اشاعت کے حوالے سے مندرجہ ذیل سوال و جواب کی صورت میں درج ہے:

''سوال: شریعت بل جو صوبہ سرحد کی کونسل میں بہت سے مشکلات کے مدارج طے کرتا ہوا، اب برائے رائے عامہ مشتہر ہو چکا ہے، ایک گروہ مسلمانوں کا اس شریعت بل سے انکار کرتا ہے اور دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ یہ مکمل شریعت نہیں ہے۔ دوسرے یہ غیر مذہب سے شریعت کو مانگا گیا ہے۔ آپ اپنی رائے سے مطلع کریں۔

جواب: ''شریعت بل'' کا مسودہ اگرچہ ضرورت سے بہت کم ہے، لیکن اس کو بطور توطیہ و تمہید کے پیش کر کے منظور کرانے کی سعی ناجائز نہیں ہے۔ اس کی منظوری کے بعد

بقیہ ضروریات کی تحصیل کرانے کے لیے کوشش کا راستہ نکل آئے گا۔''

عورتوں کو وراثت میں حصہ دلانے کے حوالے سے پون صدی قبل ہونے والی اس جدوجہد کا تذکرہ کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ یہ بات قارئین کے ذہن میں رہے کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کو ان کے حقوق، بالخصوص حق وراثت میں ان کا حصہ دلانے کے لیے پہلے بھی علمائے کرام نے آواز اٹھائی تھی اور اب بھی اس کی تجویز علما ہی کی طرف سے سامنے آئی ہے جسے چودھری شجاعت حسین صاحب نے ایک مسودہ قانون کی صورت میں قومی اسمبلی میں پیش کر دیا ہے، جبکہ ہماری دوسری غرض علمائے کرام اور دینی حلقوں کی سیاسی قیادت کو توجہ دلانا ہے کہ کیا ہم خود معاشرہ کے مظلوم طبقوں کے حقوق کے حوالے سے سماجی اور قانونی جدوجہد کے داعی نہیں بن سکتے؟ یہ ہمارے اکابر کا ورثہ ہے کہ انھوں نے عوام کے مسائل اور معاشرہ کے مظلوم طبقوں کی مظلومیت اور حقوق کے حوالے سے ہمیشہ داعی بن کر جدوجہد کی ہے، لیکن آج ہماری تمام تر تگ ودو چند سیاسی دائروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور عملی مسائل اور حقوق کی بات ہماری طرف سے سامنے نہیں آتی۔ یہ ایک سنجیدہ سوال ہے، اس لیے کہ جب ہم نے عوام کے عملی اور حقیقی مسائل کا میدان خود سیکولر لابیوں اور این جی اوز کے لیے کھلا چھوڑ رکھا ہے تو ان مسائل کے شرعی حل کی توقع ہم آخر کس خوش فہمی میں قائم کر لیتے ہیں۔

(۱۶ر فروری ۲۰۰۶)

ضمیمہ

تحفظ نسواں بل کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علما کی طرف سے

چودھری شجاعت حسین کو پیش کی جانے والی تحریر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ومکرم چودھری شجاعت حسین صاحب، صدر پاکستان مسلم لیگ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے پارلیمنٹ میں بھی اور پارلیمنٹ سے باہر بھی یہ اعلان کیا تھا کہ تحفظ نسواں کے نام سے جو بل پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے، اگر اس میں کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف ثابت ہوگئی تو آپ ۳۱ر دسمبر تک اسے درست کرانے کی کوشش کریں گے، اور اگر درست کرانے میں کامیاب نہ ہوسکے تو قومی اسمبلی سے استعفا دے دیں گے۔

اب ہمارا یہ وفد جو تمام مکاتب فکر کے علما پر مشتمل ہے، آپ پر یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ تحفظ نسواں بل، جو اب ایکٹ بن چکا ہے، اس میں مندرجہ ذیل باتیں قرآن وسنت کے بالکل خلاف ہیں:

ا۔ اس ایکٹ میں 'زنا بالجبر' کی اس حد کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے جو قرآن وسنت نے مقرر کی ہے۔

(۲) 'زنا بالرضا' کی صورت میں اگرچہ حد کو نا قابل دست اندازئ پولیس بنا کر باقی رکھا گیا ہے، لیکن حدود آرڈی ننس کی دفعہ ۲۰ شق نمبر ۵ کو حذف کر کے صوبائی حکومت کو حد کی سزا میں تخفیف

اور رعایت کا جو اختیار دیا گیا ہے، وہ صراحتاً قرآن وسنت کے خلاف ہے۔

(۳) قذف آرڈی ننس میں ترمیم کر کے مرد کو جو چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کے باوجود 'لعان' کی کارروائی میں شرکت سے انکار کر کے عورت کو معلق چھوڑ دے، یہ حکم بھی قرآن وسنت کے واضح احکام کے خلاف ہے۔

(۴) قذف آرڈی ننس میں مذکورہ ترمیم کا وہ حصہ بھی قرآن کریم کے خلاف ہے جس میں عورت کو رضا کارانہ اقرار جرم کے باوجود سزا سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

یہ چار باتیں تو واضح طور پر قرآن وسنت کے خلاف ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل باتیں اگرچہ ضابطہ کار سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ان کے نتیجے میں فحاشی کے مجرموں کو جو تحفظ دیا گیا ہے، وہ اسلامی احکام کی روح کے خلاف ہے:

(۱) زنا کو، چاہے وہ قابل حد ہو یا قابل تعزیر، ناقابل دست اندازیٔ پولیس قرار دینا اور مستغیث کو پابند کرنا کہ وہ اپنے ساتھ لازماً چار یا دو گواہ لے کر جائے، ورنہ اس کی شکایت قابل سماعت نہ ہوگی۔

(۲) عدالتوں پر یہ پابندی عائد کرنا کہ شہادت کے مطابق مختلف جرائم سامنے آنے پر وہ دوسرے جرائم میں سزا نہیں دے سکتیں، مجرموں کی حوصلہ افزائی ہے۔

ان تمام باتوں کے دلائل اس مضمون میں بیان کیے گئے ہیں جو اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے۔ ہمارا یہ وفد ان امور کو آپ کے سامنے واضح کر کے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ اب آپ کا یہ فریضہ ہے کہ آپ نے پارلیمنٹ میں بھی اور پارلیمنٹ سے باہر بھی قوم سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کریں۔

ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم خالص دینی اور ملی جذبے کے تحت آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمارا نہ تو ملکی عملی سیاست سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہم کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے پہلے علما کو جو مشاورت کے لیے بلایا تھا، وہ بھی خالص دینی حوالے سے تھا۔

وما علینا الا البلاغ۔

تائید و توثیق و تصویب علمائے کرام و مفتیان عظام:

جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (نائب صدر دارالعلوم کراچی)

مولانا مفتی منیب الرحمٰن (صدر تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان)

مولانا محمد حسن جان (شیخ الحدیث پشاور)

مولانا حافظ فضل الرحیم (نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور)

مولانا محمد حنیف جالندھری (ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان)

مولانا سید قاضی نیاز حسین نقوی (نائب صدر وفاق المدارس الشیعہ پاکستان)

مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی (ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان)

مولانا حافظ عبدالرشید اظہر (نمائندہ وفاق المدارس السّلفیہ پاکستان)

مولانا انوار الحق (نائب مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)

مولانا قاضی عبدالرشید (مہتمم دارالعلوم فاروقیہ راول پنڈی)

مولانا ظہور احمد علوی (مہتمم جامعہ محمدیہ اسلام آباد)

مولانا مفتی عبدالرحمٰن (مہتمم دارالقرآن والحدیث راول پنڈی)

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر (مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی)

مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی (مہتمم دارالعلوم زکریا اسلام آباد)

مولانا ملازم حسین (پرنسپل مدینۃ العلم اسلام آباد)

مولانا محمد نذیر فاروقی (مہتمم مدرسہ معارف القرآن اسلام آباد)

مولانا اخلاق احمد (مہتمم مدرسہ عربیہ ظہور الاسلام تلہ گنگ)

جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر کے ساتھ

ایک علمی وفکری مکالمہ

- o پاکستان کی عملی سیاست میں علما کا کردار
- o علما کا آزادانہ فتویٰ دینے کا حق
- o جہاد کے لیے حکومت واقتدار کی شرط
- o زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس لگانے کا جواز

از قلم:

ابو عمار زاہد الراشدی / معز امجد

خورشید ندیم / ڈاکٹر فاروق خان

صفحات: ۲۰۰ ۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

O

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

تقسیم کنندہ: دار الکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ

(ایک تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

- مسجد اقصیٰ کی مختصر تاریخ
- یہود کے حق تولیت کی شرعی حیثیت
- عام نقطہ نظر کے استدلالات کا جائزہ
- واقعاتی تسلسل اور مذہبی اخلاقیات
- امت مسلمہ کا تاریخی طرز عمل
- عالم عرب کا حالیہ سیاسی موقف
- کیا اس تنازع کا کوئی عملی حل ممکن ہے؟

از قلم:

محمد عمار خان ناصر

صفحات: ۱۷۶ ۔ قیمت: ۱۳۰ روپے

o

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

تقسیم کنندہ: دار الکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کا علمی و فکری مجلہ

ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ

رئیس التحریر: ابوعمار زاہد الراشدی

مدیر: محمد عمار خان ناصر

سالانہ زرِ خریداری: 120 روپے

برائے ترسیل زر: ماہنامہ الشریعہ، جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ

الشریعہ

اسلامی ویب سائٹ

اردو زبان میں

اسلام کیا ہے؟	مضامین و مقالات
ماہنامہ الشریعہ	آپ نے پوچھا
اسلامی ویب سائٹس	ڈائریکٹری

www.alsharia.org